باب دو ازدھم

خلیج کی جنگ: ''جنگوں کی ماں؟''

آج سب سے پہلی تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ گزشتہ جمعہ کے کالم میں حضرت مہدی کے نام کے ساتھ ہر جگہ ''علیہ السلام'' کی مخفف علامت ''ؑ'' درج ہوئی ہے۔ یہ ادارۂ نوائے وقت کے کسی کارکن کے حسن عقیدت کی مظہر ہے، جو میرے مسودے میں موجود نہیں تھی۔ میرے نزدیک اگرچہ خالص لغوی اور لفظی اعتبار سے تو جب ہم مسلمان ایک دوسرے سے ملاقات کے موقع پر ''السلام علیکم'' کہتے ہیں تو یقیناً کسی زندہ یا فوت شدہ مسلمان کے لیے ''علیہ السلام'' کے الفاظ بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر چونکہ قرآن حکیم میں اہل ایمان سے خطاب کر کے کہا گیا ہے: ''هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ'' (سورۃ الاحزاب:۴۳) یعنی اے اہل ایمان! ''اللہ تم پر اپنی رحمتیں نازل فرماتا رہتا ہے'' تو اس پر قیاس کرتے ہوئے کسی بھی حاضر و موجود مسلمان سے ''صلی اللہ علیك'' اور فوت شدہ یا غیر موجود مسلمان کے لیے ''صلی اللہ علیہ'' کے دعائیہ الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن امت کے تعامل یا دستور اور روایت کے تحت ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، ''علیہ السلام'' بقیہ جملہ انبیاء اور رسولوں کے لیے، ''رضی اللہ عنہ'' صحابہ کے لیے، ''رحمۃ اللہ علیہ'' بقیہ جملہ بزرگان دین اور ائمہ علم و ہدایت کے لیے اور ''مرحوم'' عام مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں، اور ان کے استعمال کے معاملے میں ع ''گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی!'' کے پیش نظر احتیاط لازمی ہے۔ اس معاملے میں اہل تشیع کا اپنا جداگانہ معمول ہے جو ان کے عقائد پر مبنی ہے۔ وہ چونکہ ائمہ اہل بیت کو ''معصوم'' قرار دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کا رتبہ انبیاء کرام سے بہت قریب ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ ان کے لیے ''علیہ السلام'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کے نزدیک ''مہدیٔ موعود'' سے مراد ان کے بارھویں امام یعنی حضرت حسن عسکریؒ کے صاحبزادے محمد المہدیؒ ہیں، جن کی ولادت تیسری صدی ہجری میں ہوئی تھی اور جو ان کے قول کے مطابق اُس وقت سے تا حال روپوش (غائب) ہیں اور قیامت کے قریب ''ظاہر'' ہوں گے، لہٰذا وہ ان کے نام کے ساتھ ''علیہ السلام'' لکھتے ہیں۔ جب کہ اہل سنت کے نزدیک حضرت مہدی اگرچہ ہوں گے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ہی میں سے، لیکن ان کی پیدائش قیامت کے قریب عام انسانوں کی طرح عبداللہ نامی شخص کے گھر میں ہوگی، اور وہ ''سلسلۂ ملاحم'' کے پر آشوب دور میں مسلمانانِ عرب کی رہنمائی اور سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دیں گے۔

اور اب آیئے اصل مضمون کے طرف۔ اس دنیا کے خاتمے سے قبل عالمی غلبۂ اسلام اور پورے کرۂ ارضی پر خلافت علی منہاج النبوت کے قیام کو میں نصوصِ شرعیہ میں سے قرآن حکیم سے دلالت نص کی بنیاد پر، اور احادیث نبویہؐ سے صراحت نص کی اساس پر ثابت کر چکا ہوں، مزید براں علامہ اقبال کے ''وژن'' کے علاوہ اس کی عقلی اور سائنسی دلیل بھی علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کے سب سے بڑے شارح اور اقبال اکیڈمی کے اوّلین ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے نظریۂ ارتقاء سے استشہاد کے حوالے سے بیان ہو چکی ہے۔ رہا ان عظیم واقعات و حوادث کا معاملہ جن کی خبریں اس سے متصلاً قبل کے دور کے ضمن میں احادیث نبویہؐ میں وارد ہوئی ہیں، تو ان سے بھی سوائے ایک یعنی نزولِ مسیحؑ کے اور کوئی بات نہ خلافِ عقل و قیاس ہے نہ مخالف قوانین طبعی۔

چنانچہ جب اس بیسویں صدی عیسوی کے دوران اس سے قبل دو عظیم جنگیں ایسی واقع ہو چکی ہیں جن کا سلسلہ کئی کئی سال تک جاری رہا، اور جن سے بڑے بڑے ملک بھی تہس نہس ہوئے اور کروڑوں کی تعداد میں انسان بھی قتل یا معذور ہوئے، تو کونسی قابل تعجب اور خلافِ عقل بات ہوگی اگر ایک تیسری عظیم جنگ بھی واقع ہو جس کا میدان مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں، اور اس کا سلسلہ بھی کئی سالوں کو محیط اور کئی ادوار پر مشتمل ہو، اور اس کے نتیجے میں جہاں عظیم تعداد میں عرب مسلمان بھی قتل ہوں، وہاں ان یہودیوں کا تو بالکل ہی قلع قمع ہو جائے جو دنیا کے کونے کونے سے وہاں آ کر آباد ہو رہے ہیں۔

اسی طرح تاریخ انسانی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب کسی قوم یا ملک کے حالات انتہائی ابتر ہو جاتے ہیں تو ؎

''خونِ اسرائیلؑ آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسم سامری!''

کے مصداق بظاہر مردہ اور از کار رفتہ قوم میں سے بھی دفعتاً کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر آتی ہے جو قوم کے تن مردہ میں نئی روح پھونک دیتی ہے اور ع ''لڑا دے ممولے کو شہباز سے!'' کے مصداق نحیف و ناتواں اور کم ہمت اور بے حوصلہ لوگوں کو بھی عظیم قوتوں سے مقابلہ کے لیے کھڑا کر دیتی ہے۔ تو کون سے تعجب کی بات ہے اگر انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں ''خونِ اسمٰعیلؑ'' بھی جوش میں آ جائے اور ؎

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!

کے مطابق اولادِ فاطمہؓ کی شاخ پر کوئی گل سرسبد کھل اٹھے؟

تاہم آج سے ساڑھے بارہ سال قبل جب میں نے پندرھویں صدی ہجری کے متوقع حوادث وواقعات کے موضوع پر تقریر کی تھی تو خود مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ان کا سلسلہ اس قدر جلد شروع ہوجانے والا ہے۔ مزید برآں جس حدیث نبویؐ کی بنیاد پر میں نے یہ بات کہی تھی کہ قیامت کے قریب پیش آنے والی عظیم جنگوں کا پہلا دور اس طور سے شروع ہوگا کہ مسلمان اور عیسائی متحد ہوکر کسی تیسری قوت کے خلاف جنگ کریں گے جس میں انہیں فتح حاصل ہوگی، وہ سنن ابی داؤدؒ کی کتاب الملاحم میں حضرت ذومخبرؓ سے مروی ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: ''عنقریب تم رومیوں (یعنی عیسائیوں) سے بھرپور صلح کروگے اور پھر وہ اور تم متحد ہوکر ایک ایسے دشمن کے خلاف جنگ کروگے جو تمہارے عقب میں واقع ہوگا۔ پھر تمہاری مدد ہوگی، چنانچہ تم غنیمت حاصل کروگے اور خود سلامت رہوگے!'' اور اُس وقت گمانِ غالب یہ تھا کہ اس جنگ میں ایک جانب امریکہ کی سربراہی میں یورپ کی جملہ عیسائی حکومتیں اور اکثر مسلمان ملک خصوصاً عرب حکومتیں ہوں گی اور دوسری جانب روس اور اس کے طفیلی ممالک ہوں گے۔ اور اُس وقت یہ خیال تک نہ ہوسکتا تھا کہ اس وقت سوویت یونین نوع ''یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری!'' کا نقشہ پیش کررہی ہوگی، اور وہ تیسری طاقت عین جزیرہ نمائے عرب کے ''عقب'' میں واقع ہوگی، یعنی صدام حسین کی سربراہی میں عراق کی بعثی حکومت! حالانکہ نہایت مستند احادیث میں یہ ذکر موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ عراق میں سونے کا خزانہ یا پہاڑ برآمد ہوجائے گا، جس کی وجہ سے وہاں نہایت خوں ریز اور خوفناک جنگ ہوگی، لیکن چونکہ ان احادیث کے متن میں کوئی لفظی تعلق قیامت سے قبل کے سلسلۂ ملاحم کے ساتھ موجود نہیں ہے، لہٰذا ان میں وارد خبر کو ایک جداگانہ اور مستقل بالذات معاملہ سمجھا گیا۔ لیکن اب جب کہ الفاظ قرآنی ''اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ'' کے مصداق وہ واقعہ ظہور پذیر ہوچکا ہے، ان احادیث نبویہؐ کی عظمت بھی اظہر من الشمس ہوگئی ہے کہ: (۱) صحیح بخاریؒ اور صحیح مسلمؒ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک خزانہ برآمد ہوجائے گا!'' اور (۲) صحیح مسلمؒ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''گمان ہے کہ فرات سے سونے کا ایک پہاڑ برآمد ہوجائے گا۔ تو جب لوگ اس کے بارے میں سنیں گے تو اس پر ٹوٹ پڑیں گے، تو جو لوگ اس کے پاس ہوں گے وہ سوچیں گے کہ اگر ہم نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ ساری دولت لے جائیں گے۔ پھر اس پر جنگ کریں گے یہاں تک کہ ننانوے فیصد لوگ ہلاک ہوجائیں گے!'' (ان احادیث کو پڑھتے ہوئے یہ بات پیش نظر رہے کہ قدیم زمانے میں ملکوں اور علاقوں کو دریاؤں یا پہاڑوں یا بڑے شہروں کے نام سے موسوم کرنے کا رواج عام تھا!) تو ذرا غور فرمائیں کہ کیا یہ بات محض ''اتفاقی'' ہے اور عظمت حدیث کی دلیل نہیں کہ آج تیل کی دولت کو ''سیال سونا'' قرار دیا جارہا ہے؟ پھر کیا یہ واقعہ نہیں کہ خلیج کی جنگ کا اصل باعث یہی تیل کی دولت ہے؟ مزید برآں کیا یہ امر قابل توجہ نہیں ہے کہ عراق کے صدر صدام حسین نے اس جنگ کو ''ام المحارب'' یعنی جنگوں کی ماں یا جنگوں کے سلسلے کا نقطۂ آغاز قرار دیا؟ (واضح رہے کہ صدام حسین خواہ اپنی ذاتی حیثیت میں دینی اعتبار سے کتنی ہی ناپسندیدہ شخصیت، اور مسلمانوں اور اسلام کے حق میں اسم بامسمّی یعنی ''صد+دام'' یعنی سودا موں یا جالوں کی حیثیت رکھتا ہو، بہرحال عرب ہونے کے ناتے قرآن سے بھی واقف ہے اور حدیث نبویؐ سے بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دسمبر ۹۰ء میں مَیں نے اس کا جو طویل انٹرویو لاس اینجلس میں سی این این پر دیکھا تھا، جو ایک نہایت ماہر وشاطر شخص جان راڈر نے لیا تھا، اس کے موقع پر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کی پشت پر جو طغریٰ آویزاں تھا وہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۸ کے اس حصے کا تھا: ''بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ'' یعنی ''ہم حق کا کوڑا باطل کے سر پر دے مارتے ہیں، جو اس کے دماغ کا بھرکس نکال دیتا ہے اور اس طرح باطل نیست ونابود ہوجاتا ہے!'')۔ رہی یہ بات کہ ننانوے فیصد کی ہلاکت کی بات صحیح ثابت نہیں ہوئی تو اوّلاً اس کا بھی امکان ہے کہ وہ الفاظ کسی خاص محاذ سے متعلق ہوں، مثلاً، جیسے کہ سب کو معلوم ہے، کویت سے پسپا ہونے والی عراقی فوج کا جو حشر ہوا، اس پر تو یہ الفاظ پوری طرح منطبق ہوتے ہیں۔ اور ثانیاً ابھی عراق کا معاملہ ختم کہاں ہوا ہے؟ ابھی تو صدام حسین امریکہ اور اس کے حواریوں کے حلق میں پھنسی ہوئی ہڈی بنا ہوا ہے کہ نہ اگلی جائے نہ نگلی جائے! (اسلیے کہ اس کے خاتمے کا مطالب اس پورے علاقے کو ایران کے حلقۂ اثر میں دے دینا ہوگا!) تو کون سے تعجب کی بات ہوگی اگر کسی آئندہ راؤنڈ میں امریکہ اور اس کے اتحادی دو سال قبل کی وحشیانہ بمباری سے بھی سوگنا زیادہ پیمانے پر بمباری کریں، اور کسی خاص شہر یا علاقے میں تباہی اس درجہ کی ہوجائے جس کا نقشہ حدیث نبویؐ میں سامنے آتا ہے؟ اس لیے کہ خلیج کی جنگ سے یہ حقیقت واضح ہوچکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ان کے کسی ایک سپاہی کو بھی کوئی گزند نہ پہنچے خواہ دشمن کا بچہ بچہ ہلاک ہوجائے۔

اس موقع پر اس امر کا ذکر بھی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت یوحنا کے مکاشفات میں بھی، جو بائبل کے عہد نامۂ جدید کی آخری کتاب میں درج ہیں، عراق کی ایسی ہی شدید تباہی کا ذکر بتکرار واعادہ موجود ہے۔ ان مکاشفات میں عراق کو ''بڑے شہر بابل'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور سب سے حیران کن امر یہ ہے کہ اس ''شہر'' کے تین ٹکڑے ہو جانے کی نہایت واضح الفاظ میں خبر دی گئی ہے۔ (دیکھئے کتاب ''مکاشفات'' کے باب ۱۶ کی آیات ۱۸۔۱۹) اور آج یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے موجود ہے کہ عراق بالفعل تین حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ چنانچہ شمال میں کردستان تقریباً خودمختار ہو چکا ہے اور جنوبی علاقے کو ''فلائی زون'' قرار دے کر عملاً عراق کی حکومت کے کنٹرول سے آزاد کر دیا گیا ہے، اور صرف بقیہ درمیانی علاقے پر حکومت بغداد کی واقعی عملداری باقی رہ گئی ہے۔

اسی طرح آج سے ساڑھے بارہ سال قبل خود میرے لیے یہ بات ناقابل قیاس تھی کہ دنیا میں پھر کوئی ''صلیبی جنگ'' چھڑ سکتی ہے اور سند کی بنیاد پر حدیث نبویؐ پر اعتماد کے باوجود مغربی دنیا کے عام سیکولر مزاج کے باعث یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جن ''ملاحم'' یعنی جنگوں کی احادیث میں خبر دی گئی ہے ان کا دوسرا دور ''مذہبی'' اساس پر ہوگا، لیکن اب یہ حقیقت چشم سر کے سامنے موجود ہے کہ بوسنیا ہرزیگووینا سے ایک ''صلیبی جنگ'' کا بالفعل آغاز ہو چکا ہے۔ یادش بخیر، یہ بیسویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بہت عجیب ہے کہ اس کے آغاز میں بھی ایک عظیم الشان سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور ایک چھوٹے سے ملک ترکی کے سوا دنیا کے نقشے سے اس کا نام ونشان مٹ گیا، اور اختتام پر بھی ایک عظیم سلطنت یعنی سوویت یونین نسیاً منسیا ہو گئی۔ اسی طرح اس کی پہلی دہائی میں بھی ایک جنگ بلقان ہوئی تھی جو پہلی عالمگیر جنگ کی تمہید بنی تھی اور آخری دہائی میں بھی دوسری جنگ بلقان شروع ہو چکی ہے، جو احادیث نبویؐ میں وارد پیشینگوئی کے مطابق تیسری عالمگیر جنگ کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگی! واللہ اعلم!

اہل مغرب سیاسی نظریئے کی حیثیت سے سیکولرزم کے ساتھ اپنی تمام تر وابستگی، اور تہذیب وثقافت کے اعتبار سے اپنی مبینہ رواداری اور وسیع المشربی کے باوجود تاحال جذباتی اور نفسیاتی سطح پر جس مذہبی عصبیت ہی نہیں تعصب میں مبتلا ہیں، اس کا ایک نمایاں مظہر تو یہ ہے کہ ترکی اپنے آپ کو مغربی تہذیب وتمدن میں پوری طرح رنگ دینے اور سیکولرزم کو نہ صرف عملاً اختیار کرنے بلکہ دستور وآئین کی سطح پر اپنے مضبوط ترین تحفظات عطا کرنے، اور اس طرح گویا ع ''میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو!'' پر پوری طرح عمل پیرا ہو جانے کے باوجود تاحال یورپ کی ''من کامن مارکیٹ'' کو ع ''ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو!'' پر آمادہ نہیں کر سکا۔ اور دوسرا اہم مظہر جس کی جانب اکثر مسلمانوں کی توجہ اس بناء پر نہیں ہوئی کہ وہ خود اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں، یہ ہے کہ سال ۱۹۹۲ء کو پوری مغربی دنیا نے ''اسپین کا سال'' قرار دے کر جوش وخروش سے منایا۔ چنانچہ پورا ملک دلہن کی طرح سجایا گیا اور ورلڈ اولمپک وہاں رکھ کر پوری دنیا کو وہاں آنے کی دعوت دی گئی، تاکہ دنیا بھر کے لوگ ان کے جشن مسرت میں شریک اور ان کی مسرت وشادمانی کی شدت کا مشاہدہ کر سکیں..... اور یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ چونکہ ۱۴۹۲ء سقوطِ غرناطہ کا سال تھا، لہٰذا ۱۹۹۲ء میں سپین سے اسلام اور مسلمانوں کے خاتمے کو پورے پانچ سو سال مکمل ہو گئے تھے! اس سے بھی بڑھ کر قابل غور بات یہ ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد عرب اسرائیل مذاکرات کے لیے میڈرڈ کو کیوں منتخب کیا گیا، جہاں اس سے قبل کبھی کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد نہیں ہوئی تھی؟ کیا اس سوال کا کوئی جواب اس کے سوا ممکن ہے کہ عربوں کو اسرائیل کے ساتھ ایک میز پر بیٹھنے کی ''ذلت'' کے ساتھ ساتھ بقول اقبال ''تہذیب حجازی کے مزار'' کی زیارت کرانی مقصود تھی؟

اور اس ''صغریٰ'' پر اضافہ کر لیجئے اس ''کبریٰ'' کا کہ کمیونزم کے زوال اور سوویت یونین کے خاتمے کے بعد پوری مغربی دنیا نے ''مسلم فنڈامنٹلزم'' کو اپنے لیے خطرہ نمبر ایک قرار دے لیا ہے۔ چنانچہ مغربی آقاؤں کی زیر ہدایت مصر اور الجزائر میں تو احیاء اسلام کے علمبرداروں پر تعذیب وتشدد کی بھٹی دہک ہی چکی ہے، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں بھی تحقیق وتفتیش اور دارو گیر کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور کوئی عجب نہیں کہ اس پر ردعمل کے طور پر دینی مزاج کے حامل عرب نوجوان بالخصوص وہ جن کے احیائی جوش اور جذبے کو جہاد افغانستان نے زبردست مہمیز دے دی ہے، مشتعل ہو کر بے قابو ہو جائیں اور کوئی عظیم ہنگامہ برپا ہو جائے، جس کی گرما گرمی میں کسی مقام پر وہ واقعہ بھی پیش آ جائے جس کا ذکر سنن ابی داؤدؒ کی محولہ بالا روایت میں ہے، یعنی (عیسائیوں کے ساتھ مل کر ایک مشترک دشمن کے خلاف جنگ اور اس پر فتح حاصل ہونے کے بعد) ''پھر تم واپس آؤ گے اور ایک ٹیلوں والے نخلستان میں پڑاؤ کرو گے تو نصرانیوں میں سے ایک شخص اُٹھ کر صلیب بلند کرے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آ گئی۔ اس پر مسلمانوں میں سے ایک شخص غضبناک ہو کر صلیب کو توڑ ڈالے گا، اس پر رومی (عیسائی) صلح ختم کر دیں گے اور بڑی جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے!'' واضح رہے کہ اس قسم کے واقعات بسا اوقات بارود کو چنگاری دکھانے کے مترادف بن جایا کرتے ہیں..... اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسا کوئی واقعہ نجد کے شمال مشرقی علاقے میں جو امریکہ کے فوجی اڈے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، کسی بھی وقت رونما ہو سکتا ہے۔

قصہ مختصر، ایک عظیم ''صلیبی جنگ'' کے لیے میدان تیزی کے ساتھ ہموار ہو رہا ہے، جو احادیثِ نبویہؐ کے مطابق بہت طویل ہوگی اور جس کے کئی مراحل ہوں گے جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، البتہ ایک بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان کے دوران ایک جنگ جسے ''الملحمة العظمی'' قرار دیا گیا ہے، نہایت عظیم اور حد درجہ خوفناک ہوگی۔ (اس موضوع پر ایک نوجوان محقق قاضی ظفر الحق نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ تحقیق کی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مضمون گذشتہ سال آٹھ اقساط میں ''ندائے خلافت'' میں شائع کیا گیا تھا جو ہنوز نامکمل ہے۔ مکمل ہونے پر اسے ان شاء اللہ کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے گا۔) تاہم اس کا اصل حاصل اور لب لباب یہ ہے کہ ان جنگوں کے دوران شدید جانی و مالی نقصانات کی صورت میں امت مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب کو ان کے اس اجتماعی جرم کی بھرپور سزا مل جائے گی، جس کا ارتکاب انہوں نے دین حق کے نظام عدل وقسط کو ایک کامل نظام زندگی کی صورت میں قائم نہ کر کے کیا ہے۔ ان جنگوں میں ایک مرحلے پر ''دارالاسلام'' صرف حجاز تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور دشمن مدینہ منورہ کے ''دروازوں'' تک پہنچ جائے گا۔ لیکن پھر رحمتِ خداوندی جوش میں آئے گی، مسلمانانِ عرب ایک نئی ہیئت اجتماعی تشکیل دیں گے اور ایک نئے قائد و امیر محمد ابن عبداللہ المہدی کے ہاتھ پر ''بیعت'' کر کے جوابی کارروائی کے لیے مستعد ہو جائیں گے۔

اس موقع پر بھی یہ تذکرہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا کہ عیسائیوں کی روایات میں بھی اس دنیا کے خاتمے سے قبل ایک عظیم جنگ کا ذکر موجود ہے، جو حق اور باطل کے مابین ہوگی۔ چنانچہ حضرت یوحنا کے جن مکاشفات کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے ان ہی میں نہ صرف یہ کہ اس جنگ کا ذکر بھی موجود ہے، بلکہ یہ صراحت بھی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لیے ''مشرق کے بادشاہوں کی فوجیں'' بھی آئیں گی! مکاشفات میں اس جنگ کے دن کو ''خدائے اعظم وقادر کا دن'' کہا گیا ہے اور اس کے محل وقوع کا نام ''آرمیگاڈان'' بتایا گیا ہے۔ (دیکھئے ''مکاشفات'' باب ۱۶ آیات ۱۲ تا ۱۶) گویا حدیث نبویؐ کا ''الملحمة العظمی'' اور بائبل کا ''آرمیگاڈان'' ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں!

احادیثِ نبویہؐ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے پہلے مرحلوں میں مقابلہ صرف عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوگا، اور یہودی اگرچہ پس پردہ تو شریک ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران اس صورت حال کی بھی ایک ابتدائی جھلک دنیا کے سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے اسرائیل کو جنگ میں شرکت سے روکے رکھا، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پوری کی۔ (چنانچہ اتحادی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل شوارز کراف نے تو بعد میں ''نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں۔ فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا!'' کے مصداق یہ ''ان کہنی'' بھی کہہ دی کہ ''ہم نے یہ جنگ اسرائیل کے تحفظ ہی کے لیے لڑی تھی!'')...... تاہم جب حضرت مہدی کی قیادت میں اور مشرق سے آنے والی کمک کی مدد سے مسلمانانِ عرب کامیابیاں حاصل کرنی شروع کریں گے تو یہودی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور یہی مرحلہ ''المسیح الدجال'' کے خروج کا ہو گا...... جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر عذاب الٰہی کے کچھ مزید اور شدید تر کوڑے پڑیں گے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نازل ہوں گے اور ان کے ہاتھوں نہ صرف یہ کہ دجال قتل ہوگا، بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل پر بھی اللہ کا وہ عذاب استیصال نازل ہو جائے گا، جس کے مستحق وہ اب سے دو ہزار برس قبل حضرت مسیحؑ کا انکار کر کے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اگرچہ ابتداءً مسیح الدجال کے ہاتھوں ''عظیم تر اسرائیل'' وجود میں آ جائے گا، تاہم بالآخر وہی ''عظیم تر اسرائیل'' سابقہ معزول ومغضوب امت مسلمہ کا ''عظیم تر قبرستان'' بن جائے گا۔

جہاں تک دجالی فتنے، دجالِ اکبر اور مسیح الدجال کی شخصیت (یا شخصیتوں) کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کا ذکر احادیث نبویہؐ میں جن مختلف پیرایوں میں آیا ہے، ان کے بعض پہلو کم از کم راقم الحروف کے علم وفہم کی حد تک تا حال عقدۂ لاینحل کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کے حل کے لیے کسی عظیم اور محقق محدث ہی کا انتظار کرنا ہوگا۔ البتہ اس مسئلے کے چند پہلو بالکل واضح بھی ہیں، بالخصوص ''ملاحم'' کے سلسلے میں جس مسیح دجال کے خروج کا ذکر آتا ہے اس کا معاملہ اپنی جگہ بھی بالکل واضح ہے، اور دنیا کے موجودہ حالات جو رخ اختیار کر چکے ہیں ان کے پیش نظر تو بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ظہور وخروج کے لیے سٹیج بھی بالکل تیار ہو چکا ہے۔

دجالی فتنے کے بارے میں اب سے کوئی ساٹھ برس قبل سورۃ الکہف کے حوالے سے ایک نہایت مفصل اور عالمانہ تحریر ایک ایسے عالم وفاضل شخص کے قلم سے نکلی تھی، جو معقول و منقول اور شریعت وطریقت چاروں کے جامع بھی تھے اور ان میں سے ہر ایک میں نہایت بلند مقام اور اعلیٰ مرتبے کے حامل بھی، یعنی مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ راقم کو ان کے نقطۂ نظر سے کامل اتفاق ہے۔ چنانچہ راقم نے بھی ان مباحث کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ اپنے سورۃ الکہف کے دروس میں بیان کیا ہے جو بحمد اللہ آڈیو کیسٹس کی صورت میں محفوظ ہیں۔

ان مباحث کا لب لباب یہ ہے کہ دجالی فتنے سے مراد عہد حاضر کی مادہ پرستانہ تہذیب ہے جس کے پورے تانے بانے اور تمام تر رگ وپے میں یہ نقطۂ نظر سرایت کیے ہوئے ہے کہ اصل اہمیت کی حامل اور توجہ والتفات کے قابل یہ کائنات ہے نہ کہ خالق کائنات کی ذات، اور مادہ اور اس کے خصائص وقوانین ہیں نہ کہ روح اور اس کی کیفیات، اور یہ حیاتِ دنیوی اور اس کی فلاح وبہبود ہے نہ کہ حیاتِ اخروی اور اس کی فوز ونجات۔ چنانچہ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کا نتیجہ ہے کہ خالق نے انسان کو علم کے حصول کے جو دو ذرائع عطا کیے تھے، یعنی (۱) حواسِ ظاہری اور ان سے حاصل شدہ معلومات سے استدلال اور استنباط کے لیے عقل کا استعمال، اور (۲) مافوق الطبیعی حقائق تک رسائی اور عملی ہدایت کے لیے وحی آسمانی کی پیروی، ان میں سے انسان نے مؤخر الذکر سے بالکل صرف نظر کر لیا ہے اور ساری توجہ کو صرف مقدم الذکر پر مرکوز کر دیا ہے۔ چنانچہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو بے پناہ ترقی ہوئی لیکن اخلاق اور انسانیت کا

دیوالہ نکل گیا۔اس اعتبار سے اگر تہذیب حاضر کو ''یک چشمی'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔اس لیے کہ اس کی مادی آنکھ تو چوپٹ کھلی ہوئی ہے جب کہ روحانی آنکھ بالکل بند ہو چکی ہے۔ بہرحال اس دجالی فتنے نے اگرچہ اس وقت پورے کرۂ ارضی اور تمام عالم انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے،لیکن زیادہ افسوس اور ملامت و ماتم کے قابل ہے امت مسلمہ اور اس کا بھی افضل اور برتر حصہ یعنی مسلمانانِ عرب کہ وہ بھی قرآن حکیم ایسی کامل اور محفوظ کتاب ہدایت کے حامل اور اس پر ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود اس فتنے میں پوری شدت کے ساتھ، بلکہ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہی مبتلا ہیں۔چنانچہ کتاب الملاحم کی احادیث میں بھی ایک ایسے فتنے کا ذکر ہے جس سے ''عرب کا کوئی گھر نہیں بچے گا'' اور بظاہر احوال وہ یہی مادہ پرستی اور اس کے لازمی نتیجے یعنی عیاشی وفحاشی کا فتنہ ہے جو ان کے معاشرے میں اس لیے زیادہ شدت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے یہاں سیال سونے کے باعث دولت کی شدید ریل پیل ہوگئی ہے۔

بہرحال، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دجالی فتنے کے اثرات سے اپنے دین وایمان کو بچانے کے لیے سورۃ الکہف اور خصوصاً اس کی ابتدائی اور آخری آیات کو اکسیر کی سی تاثیر کی حامل اور تیر بہدف قرار دیا ہے وہ یہی مادہ پرستی، دنیا پرستی، زر پرستی اور شہوات پرستی کا فتنہ ہے!

اور اب آیئے دجال یا دجالوں کی جانب،تو ایک بات تو یہ بالکل واضح ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے تمام اشخاص کو ''دجال'' قرار دیا ہے اور ایک حدیث میں ان کی تعداد بھی بیان فرما دی ہے،یعنی تیس۔البتہ یہ فیصلہ کرنا کم از کم راقم کے لیے مشکل ہے کہ آیا وہ ''دجال اکبر'' جس کے فتنے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سمیت جملہ انبیاءؑ نے خود بھی اللہ کی پناہ مانگی اور اپنی امتوں کو بھی خبردار کیا، جو خدائی کا دعویٰ کرے گا اور جملہ اہل ایمان کے ایمان کے لیے شدید امتحان بن جائے گا،اور وہ مسیح الدجال جس کا ذکر کتاب الملاحم میں آخری زمانے کی جنگوں کے سلسلے میں آتا ہے ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا یہ دو جدا اشخاص ہوں گے۔البتہ جہاں تک مؤخر الذکر کا تعلق ہے اس کا معاملہ بالکل واضح اور بآسانی سمجھ میں آجانے والا ہے۔

دراصل یہود کی روایات اور عہد نامۂ قدیم میں مذکور انبیاء کرام کی پیشینگوئیوں میں ایک ایسے ''مسیحا'' کی خبر تواتر کے ساتھ وارد ہوئی تھی، جو بنی اسرائیل کو ''ذلت'' اور ''مسکنت'' سے نجات دلا کر انہیں ارضِ مقدس کے علاوہ اس پورے علاقے پر ازسرنو غلبہ اور تمکن عطا کر دے گا، جہاں تاریخ کے کسی بھی دور میں انہیں حکومت یا بالادستی حاصل رہی ہے۔چنانچہ مکابی سلطنت کے زوال کے بعد جب بنی اسرائیل پر پہلے یونانیوں اور پھر رومیوں کی محکومی مسلط ہوئی تو وہ اپنے ''مسیح موعود'' کا شدت سے انتظار کرنے لگے۔لیکن جب وہ مسیح موعود،عیسیٰ ابن مریمؑ کی صورت میں تشریف لے آئے تو یہود کی انتہائی بدبختی کہ انہوں نے بحیثیت مجموعی ان کا انکار کیا اور انہیں صرف رد ہی نہیں کیا، بلکہ کافر اور مرتد ٹھہرا کر واجب القتل قرار دے دیا اور اپنے بس پڑتے تو سولی پر چڑھوا کر ہی دم لیا۔یہ دوسری بات ہے کہ اللہ نے آنجنابؑ کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہود کے یہاں ''مسیح'' کی جگہ تاحال خالی ہے اور وہ اپنے مسیحا کا اب بھی انتظار کر رہے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے رفع سماوی کے بعد اب تک یہودیوں پر جس ذلت ومسکنت اور نکبت وادبار کے سائے رہے،ان کے مختلف ادوار کی تاریخ کسی گذشتہ صحبت میں بیان ہو چکی ہے۔اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اب سے لگ بھگ ایک سو سال قبل (۱۸۹۷ء میں) بعض نہایت ذہین لیکن عیار اور سازشی مزاج کے یہودیوں نے اپنی عظمت گذشتہ اور سطوت پارینہ کی بازیافت کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا،جس پر عمل کے نتیجے میں انہیں پہلی کامیابی ۱۹۱۷ء میں ''اعلان بالفور'' کی صورت میں حاصل ہوئی،جس کے ذریعے ارضِ فلسطین پر ان کا ''حق'' بھی تسلیم کر لیا گیا۔دوسری اور بڑی کامیابی ۱۹۴۸ء میں حاصل ہوئی جب فلسطین میں ان کی ایک آزاد ریاست قائم ہوگئی اور اسرائیل کا خنجر عالم عرب کے سینے میں پیوست ہوگیا۔پھر ایک اور کامیابی ۱۹۶۷ء میں حاصل ہوئی جب چھ روزہ جنگ کے نتیجے میں اسرائیل کی حدود میں وسعت اور رقبے میں اضافے پر مستزاد بیت المقدس یعنی یروشلم پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔حال ہی میں ایک اور کامیابی انہیں خلیج کی جنگ کے بعد حاصل ہوئی اور وہ یہ کہ فلسطینیوں سمیت تمام عرب ممالک نے اسرائیل کو اس حد تک تو تسلیم کر ہی لیا کہ اس کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے تیار ہوگئے۔اب ظاہر ہے کہ ان کی آخری منزل مقصود ع ''دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا!'' کی مصداقِ کامل بن چکی ہے اور وہ ہے عظیم تر اسرائیل کا قیام اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو۔اس آخری منزل تک پہنچنے کے لیے یہود کا سازشی ذہن ایسی تدابیر اختیار کرے گا کہ ''مسلم فنڈامنٹلزم'' کا ہوا دکھا کر مغرب کی عیسائی دنیا کو مسلمانوں خصوصاً عربوں سے لڑوا دے۔چنانچہ یہی سلسلۂ ''ملاحم'' کا اصل پس منظر ہوگا،اور اس کے ضمن میں جب اسرائیلی یہودی دیکھیں گے کہ حضرت مہدیؒ کی قیادت میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہونے لگا ہے تو کوئی اسرائیلی لیڈر ''انا المسیح'' کا نعرہ لگا کر میدان میں کود جائے گا،چنانچہ یہی ''المسیح الدجال'' ہوگا،جس کے ہاتھوں مسلمانوں کو شدید ہزیمت اٹھانی پڑے گی اور ایک بار تو عظیم تر اسرائیل قائم ہو ہی جائے گا۔یہ دوسری بات ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ اصل حضرت مسیح علیہ السلام کو بھیج کر یہودیوں کا قلع قمع کر دے گا اور وہی عظیم تر اسرائیل ان کا عظیم تر قرستان بن جائے گا۔وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!!

ان تمام امور میں ظاہر ہے کہ سوائے حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے کوئی ایک بات بھی نہ خلافِ قیاس ہے نہ عام عادی قوانین طبعی کے متضاد! البتہ عہد حاضر کے دجالی فتنے یعنی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر کے غلبے کے باعث خود مسلمان، بالخصوص ان کے جدید تعلیم یافتہ طبقات اور ان میں سے بھی خاص طور پر وہ جو فتنۂ قادیانیت اور فتنۂ انکار حدیث سے متاثر ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے رفع سماوی ہی کے قائل نہیں رہے، تو نزول کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ تاہم اس معاملے میں کسی ایسے شخص کو کوئی اشکال لاحق نہیں ہو سکتا جو ایمان رکھتا ہو کہ جملہ قوانین طبعیہ اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کے باعث اس کے ہاتھ بندھ نہیں گئے ہیں، بلکہ ''یَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ''[1] کے مصداق وہ جب چاہے ان قوانین طبعیہ کو معطل یا ساقط کر سکتا ہے۔ اسی طرح جملہ اشیاء میں تمام خواص وصفات اور کل تاثیرات اس ہی کی ودیعت کردہ ہیں، وہ جب چاہے انہیں سلب کر سکتا ہے۔ مزید برآں وہ مادی اسباب و وسائل کا محتاج نہیں، بلکہ جملہ مادی اسباب وذرائع اس کے ''اذن'' کے منتظر رہتے ہیں! الغرض یہ معاملہ ایک قادرِ مطلق اور ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ'' خدا پر ایمان بالغیب اور اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ پر یقین کامل کا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا حصۂ وافر عطا فرمائے.....آمین!

[1] ''اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔'' (سورۃ المائدہ:۶۴)

جیسے کہ گذشتہ صحبت میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مباحث میں سے اکثر کی اہمیت صرف علمی اعتبار سے ہے۔ چنانچہ ان پر گفتگو یہیں ختم ہو رہی ہے۔ ہمارے لیے عملی اعتبار سے اصل اہمیت اس امر کی ہے کہ بحیثیت پاکستانی مسلمان ہم کس مقام پر کھڑے ہیں اور ارضِ مشرق کے مکین ہونے کے ناطے ہماری کیا خصوصی ذمہ داریاں ہیں۔ چنانچہ آئندہ اسی مسئلے پر گفتگو ہوگی۔

۲۲/ جون ۱۹۹۳ء

باب سیزدھم

ملتِ اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد پونے دو ارب تک پہنچ چکی ہے، تاہم محتاط اندازوں کے مطابق بھی یہ تعداد سوا ارب کے لگ بھگ یعنی ایک سو بیس اور ایک سو تیس کروڑ کے مابین ضرور ہے۔

سورۃ الجمعہ کی دوسری اور تیسری آیات کی رو سے تو یہ امت صرف دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی ایک ''اُمّی'' عرب جن کو بقیہ تمام مسلمانوں پر مطلق فضیلت اوّلاً اس بناء پر حاصل تھی کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی میں سے تھے، اور ثانیاً اس بناء پر کہ ان ہی کی جانب آپ کی خصوصی بعثت تھی۔ چنانچہ ان ہی کی زبان میں اللہ کا آخری پیغام اور کامل ہدایت نامہ نازل ہوا۔ اور دوسرے ''آخرین'' یعنی بقیہ تمام نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے مسلمان جو وقتاً فوقتاً امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہو کر اس کی عمومی فضیلت میں شریک ہوتے چلے گئے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ امت تین حصوں میں منقسم قرار دی جا سکتی ہے یعنی:

(۱) مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ان ممالک کے لوگ جن کی مادری زبان عربی بن چکی ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ بیس کروڑ، گویا کل اُمت کا چھٹا حصہ ہیں۔ (۲) سابق برعظیم ہند اور موجودہ بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مسلمان جن کی مادری زبانیں اور بولیاں تو بے شمار ہیں لیکن سب کی ''لنگوا فرنیکا'' کی حیثیت اردو کو حاصل ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ چالیس کروڑ یعنی کل امت کا تیسرا حصہ ہیں۔ اور (۳) باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان جن کی مجموعی تعداد ساٹھ کروڑ کے قریب ہے، اور اس طرح وہ پوری امت کی مجموعی تعداد کا نصف ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کے لگ بھگ تو صرف انڈونیشیا اور ملائیشیا میں آباد ہیں، باقی دو تہائی میں ترکی، ایران اور افغانستان ایسے خالص اور قدیم مسلمان ممالک کے علاوہ مغربی اور وسطی افریقہ کے ممالک اور سابق روسی ترکستان اور چینی ترکستان میں آباد مسلمان شامل ہیں۔

ان ایک ارب کے قریب غیر عرب مسلمانوں میں ایک اضافی درجۂ فضیلت گذشتہ چار سو سال سے برعظیم پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کو حاصل رہا ہے، جس کی بناء پر ع ''جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!'' کے مصداق اللہ کے دین، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی ذمہ داری کا بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا، جسے تاریخ کی ایک کروٹ نے پورے کا پورا مسلمانانِ پاکستان کے کندھوں پر ڈال دیا ہے، جس کا صحیح فہم و شعور ع ''اپنی خودی پہچان، او غافل افغان!'' کے مصداق ملت اسلامیہ پاکستان کے لیے نہایت ضروری ہے۔

سب جانتے ہیں کہ فضل یا فضیلت خالص وہبی شے ہے اور عالم انسانی میں فضیلت کی اصل اساس نبوت رہی ہے۔ چنانچہ سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی اس عظیم فضیلت کی بنیاد جس کا ذکر سورۃ البقرہ کی دو آیات (۴۷ اور ۱۲۲) میں ان الفاظ میں وارد ہوا کہ: ''**وانی فضلتکم علی العالمین**'' یعنی ''میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمادی تھی!'' یہی تھی کہ ان میں حضرت موسیٰؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک پورے چودہ سو برس نبوت کا سلسلہ اس طور سے جاری رہا کہ کبھی یہ تار ٹوٹا ہی نہیں! حضرت عیسیٰؑ کے بعد مسلسل چھ سو سال ''فترت اولیٰ'' کا زمانہ ہے، جس کے دوران نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کے بعد نبوت و رسالت کا ماہِ کامل یا خورشید جہاں تاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں طلوع ہوا، جن کے سر مبارک پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کا تاج رکھا گیا۔ چنانچہ ایک جانب آپؐ خود ''اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا''[۱] یعنی یقیناً اللہ کا فضل آپؐ پر تو نہایت ہی عظیم و کبیر ہے!'' کے مصداقِ کامل قرار پائے۔

[۱] سورۃ بنی اسرائیل، آیت: ۸۷

تو دوسری جانب آپؐ کی امت میں شامل ہونے والے بھی خواہ وہ ''امی'' عربوں میں سے تھے، خواہ ''آخرین'' میں سے، آپؐ کے اس فضل عظیم کے وارث قرار پائے، فحوائے: ''ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ''[۱] یعنی ''یہ اللہ کا فضل ہے، وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے!''

[۱] سورۃ الجمعہ، آیت: ۴

اس لیے کہ اگرچہ آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم اور منقطع ہو گیا، تاہم حسب ذیل آیات کی رو سے آپؐ کی رسالت کے فرائض کی عالمی سطح پر اور تا قیام قیامت ادائیگی مجموعی طور پر آپؐ کی امت ہی کے حوالے کی گئی:

۱) ﴿ وَكُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ﴾ (آل عمران:۱۱۰)
''تم بہترین امت ہو جسے جملہ انسانوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تمہارا کام ہی یہ ہے کہ نیکی کا حکم دو، برائیوں سے روکو اور خود اللہ پر پختہ ایمان رکھو!''
۲) ﴿ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ ..... لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (الحج:۷۸)
''اللہ کی راہ میں جہاد کرو، جتنا اور جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں منتخب فرمالیا ہے..... تاکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر حجت قائم کریں اور تم پوری نوع انسانی پر حجت قائم کرو!''

اِس فریضۂ رسالتِ محمدیؐ کی ادائیگی اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری اگرچہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت مجموعی ڈالی گئی ہے، تاہم ع ''جن کے رُتبے ہیں سوا، ان کی سوا مشکل ہے!'' اور ؎

''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!''

کے مصداق، اور اللہ تعالیٰ کے اس ابدی قانون کے مطابق کہ ''اللہ ہر ایک پر ذمہ داری کا بوجھ اس کی وسعت کے مطابق ہی ڈالتا ہے!'' جو قرآن حکیم میں متعدد بار بیان ہوا ہے،[۲]

۲ جیسے مثلاً سورۃ البقرہ:۲۳۳ اور ۲۸۶، سورۃ الانعام:۱۵۲، سورۃ الاعراف:۴۲ اور سورۃ المومنون:۶۲

اس عظیم ذمہ داری کا سب سے زیادہ بوجھ ان لوگوں پر ہے جن کی مادری زبان عربی ہے، لہٰذا انہیں قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے کسی اضافی محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے! اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم ہی نبوت کے اس سلسلے کا اصل قائم مقام ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر ختم اور منقطع ہو چکا ہے۔

تاہم ختم نبوت سے جو خلا پیدا ہوا اس کو پُر کرنے کی ایک اضافی تدبیر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے تحت یہ اختیار فرمائی کہ ایک جانب مجددین کا سلسلہ جاری فرمایا جو وقتاً فوقتاً دین کی اصل تعلیمات اور اللہ کی اصل ہدایت کو از سرِ نو نکھار کر پیش کرتے رہے۔ اور دوسری جانب یہ ضمانت دے دی کہ ''اس امت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔'' (بخاریؒ و مسلمؒ عن معاویہؓ) اور یہ دونوں امر اس اعتبار سے باہم لازم و ملزوم ہیں کہ بالکل فطری اور منطقی طور پر ہر مجدد کی تعلیمات اور مساعی کے نتیجے میں لامحالہ ایک حلقہ یا گروہ ایسا وجود میں آتا رہا، جو دین حق کی اصل تعلیمات کا علمبردار اور اپنے وجود کے اعتبار سے کم از کم ذاتی زندگی اور انفرادی سیرت و کردار کی حد تک اسلام کی حقیقی تعلیمات کا نمونہ اور آئینہ دار بن گیا۔ اگرچہ دنیا کے اس طبعی قانون کے مطابق کہ ہر جوانی پر لازماً بڑھاپا بھی آ کر رہتا ہے اور ہر کمال کو بالآخر زوال سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے، یہ حلقہ یا گروہ یا جماعت دوسری یا تیسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی نسل تک پہنچ کر لازماً ایک تقلیدی اور موروثی ''فرقہ'' بن جاتا رہا، اور اس طرح ایک نئے مجدد کی ضرورت پیش آتی رہی، جس کے زیر اثر ایک نئی جمیعت یا جماعت وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ میں مجددین کے ضمن میں سو سو سال کے وقفے کا ذکر ہے، یعنی: ''اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو سال کے سرے پر ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتے رہیں گے یعنی اسے تازہ کرتے رہیں گے۔'' (ابوداؤدؒ عن ابی ہریرہؓ)

بہرحال ان مجددین امت اور ان کے تلامذہ اور متبعین کی مساعی کے نتیجے میں دین حق کی تعلیمات گذشتہ چودہ سو سال کے دوران اسی طرح منتقل ہوتی چلی آئیں، جس طرح اولمپک ٹارچ (مشعل) ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کو منتقل ہوتی رہتی ہے، یا شیر شاہ سوری کے زمانے میں ڈھاکہ سے پشاور تک ڈاک کے تھیلے ہر تیس میل کے بعد ایک گھڑسوار سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے!

اور اب اس پس منظر میں مشاہدہ فرمائیے اس عظیم حقیقت کا کہ پورے ایک ہزار برس تک مجددین کا یہ سلسلہ عالم عرب ہی میں جاری رہا۔ چنانچہ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ اور حضرت حسن بصریؒ سے امام غزالیؒ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ تک پورے سات سو برس کے عرصے میں تمام مشاہیر علماء، ائمہ ہدایت اور مجددین امت عالم عرب ہی میں پیدا ہوتے رہے۔ لیکن فتنۂ تاتار کے دوران جب کہ وسطی اور مغربی ایشیا شورش و ہلاکت اور تباہی و بربادی کا شکار ہوئے اسلام کی علمی اور روحانی وراثت تدریجاً سرزمین ہند کو منتقل ہوتی چلی گئی، تاآنکہ جیسے ہی امت کی تاریک کے ''الف ثانی'' یعنی دوسرے ہزار سالہ دور کا آغاز ہوا تجدید دین کا اصل مرکز ہندوستان بن گیا۔ چنانچہ گیارھویں صدی ہجری کے عظیم ترین مجدد شیخ احمد سرہندیؒ بھی یہیں پیدا ہوئے، جن کے مرقد کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ع ''وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار'' اور جن کی ذات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ع ''جن کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار!'' پھر بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے، جو تنہا اپنی ذات میں جملہ علوم اسلامی ہی کے مجدد نہیں فکر اسلامی اور حکمت دینی کے بھی مجدد اعظم تھے۔ پھر تیرہویں صدی ہجری میں سید احمد بریلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے، جو بلاشبہ سلوکِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم اور جہادِ اسلامی کے مجدد اعظم تھے اور ان کا ان کے ساتھی شہداء کا خون سرزمین بالاکوٹ میں جذب ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدند
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

اسی طرح چودھویں صدی ہجری (جسے ختم ہوئے ابھی صرف تیرہ برس ہوئے ہیں!) میں بھی جو اعاظم رجال سرزمین ہند میں پیدا ہوئے ان کی نظیر پورا عالم اسلام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ طبقۂ علماء میں سے اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ایسی عظیم شخصیت، اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے علامہ اقبال ایسا مفکر ملت اور حکیم امت، پھر مولانا محمد الیاس ایسا عظیم مبلغ اور مولانا مودودی ایسا عظیم مصنف پورے عالم اسلام میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا! (ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ)[1]

[1] ترجمہ: ''یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔'' (سورۃ الجمعہ، آیت:۴)

الغرض، گزشتہ پوری چار صدیوں کے دوران اگر دین کے علم وفکر ہی نہیں، دعوت وجہاد کی تجدید کا مرکز بھی ہندوستان بنا رہا تو ظاہر ہے کہ یہ مشیت ایزدی کے تحت ہی ہوا اور جس طرح علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ سے مخاطب ہوکر فرمایا تھا کہ ع ''برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر!'' اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ''الف ثانی'' کی ان تجدیدی مساعی نے ملت اسلامیہ ہند یہ کے سر پر ایک عظیم دستارِ فضیلت باندھ دی ہے جس کی بناء پر اس کی ذمہ داری بھی بقیہ پوری امت مسلمہ کے مقابلے میں نہایت عظیم، گراں اور دَہ چند ہی نہیں سوگنا بن گئی ہے۔

اور اب توجہ فرمائیے تاریخ کی اس ''کروٹ'' کی جانب جس کے نتیجے میں اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملت اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر آ گیا ہے۔ یہ کروٹ تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیام پاکستان سے عبارت ہے، جس کا اعلانیہ مقصد اسلام نظامِ عدل اجتماعی کا قیام اور پورے عالم انسانیت کے سامنے اسلام کے ''اصول حریت واخوت ومساوات کا ایک نمونہ'' پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مفکر ومصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنے خطبہ الٰہ آباد (۱۹۳۰ء) میں فرمایا تھا کہ: ''مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیر مبرم ہے۔ اور اگر ایسا ہوگیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت (امپیریلزم کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دوبارہ اصل اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرسکیں!'' اور بانی ومعمارِ پاکستان محمد علی جناح نے بھی بارہا ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اور قیام پاکستان کی صورت میں غالب اور جارح ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں شامل رہ جانے والے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی ؎

''جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!''

کے مصداق اس سے بالکل بے پروا ہوکر کہ تقسیم ہند کے بعد ان پر کیا بیتے گی تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ ہی نہیں اصل فیصلہ کن کردار ادا کرکے گویا مذکورہ بالا چار صد سالہ تجدیدی مساعی کی وراثت کے ناطے جو عظیم ذمہ داری جملہ مسلمانانِ ہند پر عائد ہوتی تھی اس میں سے اپنے حصے کا ''فرضِ کفایہ'' ادا کردیا، جس کی قیمت وہ تا حال مسلسل اپنے جانی ضیاع اور مالی نقصان کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ بنابریں اب اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملتِ اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر ہے، اور اس کی قسمت یا بدقسمتی بالکلیہ اسی کے ساتھ وابستہ ہے!

اور یہ بلاشبہ ہر باشعور پاکستانی مسلمان کے لیے اہم ''لمحۂ فکریہ'' ہے کہ (۱) اگر وہی بنی اسرائیل جو ''ہم نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کردی تھی!'' کے مصداق کامل تھے، اللہ کے ساتھ کیے جانے والے قول وقرار اور عہد ومیثاق سے انحراف اور اللہ کے دین اور شریعت کی غلط نمائندگی کے باعث ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کردی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!'' کی تصویر بن گئے، اور (۲) مسلمانانِ عرب بھی اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود ان ہی جرائم کی پاداش میں اللہ کے بے لاگ عدل کے باعث معزول ومعتوب ہوئے۔ چنانچہ اوّلاً اب سے ساڑھے سات سو سال قبل یعنی ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد اور خلافتِ بنوعباس کے خاتمے پر قرآن مجید میں وارد شدہ یہ تنبیہ ''اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ''[1] کے مطابق امت مسلمہ کی قیادت وسیادت سے معزول کردیئے گئے تھے اور اب بھی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں مسلسل پٹ رہے ہیں، جس کی شدت، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پیشینگوئیوں کے مطابق جن پر مفصل گفتگو اس سے قبل ہوچکی ہے۔

[1] ترجمہ: ''اگر تم پیٹھ پھیر لوگے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا!'' (سورۂ محمد، آیت:۳۸)

مستقبل قریب میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جانے والی ہے!..... تو ''كَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ''[1] کے مصداق ہم اللہ کے قانونِ عذاب، اور اصول مکافاتِ عمل سے کیسے بچ سکیں گے!

[1] ترجمہ: ''تم کیونکر بچوگے اگر تم نے انکار کیا!'' (سورۃ المزمل، آیت:۱۷)

چنانچہ ان سطور کے راقم کو پوری شدت کے ساتھ یہ احساس لاحق ہے کہ ہم بحیثیت ملتِ اسلامیہ پاکستان اللہ کے قانونِ عذاب کی گرفت میں آ چکے ہیں، اور اس عظیم قانون کی اس دفعہ کے مطابق جو سورۂ سجدہ کی آیت ۲۱ میں وارد ہوئی ہے، یعنی: ''ہم انہیں بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ ضرور چکھائیں گے، شاید کہ یہ لوٹ آئیں!'' ہماری پیٹھ پر عذاب الٰہی کا ایک شدید کوڑا ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلبِ ماہیت، اور سب سے بڑھ کر ایک ذلت آمیز اور عبرتناک شکست کی صورت میں پڑ چکا ہے، جس کے نتیجے میں ترانوے ہزار پاکستانی ان ہندوؤں کے قیدی بنے تھے جن پر مسلمانوں نے کہیں ہزار برس، کہیں آٹھ سو برس اور کہیں چھ سو برس حکومت کی تھی!.....اور چونکہ ہم نے اس کے بعد سے آج تک اللہ اور اس کے دین کی جانب ''رجوع'' کا کوئی ثبوت نہیں دیا، لہٰذا اب ''بڑے عذاب'' کا کوڑا بھی ہمارے سروں پر اسی طرح تانا جا چکا ہے، جس طرح کبھی حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذاب استیصال کے آثار شروع ہو گئے تھے! (اگرچہ وہ عذاب قوم کی اجتماعی توبہ کے باعث ٹل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے قومِ یونسؑ کی مثال اسی خیال سے دی ہے کہ شاید اللہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی اس ہی کے مانند اجتماعی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین، یارب العالمین!) اور میری تشویش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے عذاب سے قبل بھی پچیس برس کی مہلت دی تھی (سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قیام پاکستان پر قمری حساب سے پچیس برس بیت چکے تھے!) اور اب پھر قمری حساب سے دوسرے پچیس برس کی مہلت کے ختم ہونے میں کل پونے تین سال باقی رہ گئے ہیں! الغرض، معاملہ وہی ہے کہ ع

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اور ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

اور ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو، زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

۲۹/ جون ۹۳

باب چہار دھم

پاکستان کا مستقبل

اگر چہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک تو یہ ہے کہ ''موت کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا کرو، جو تمام لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی ہے۔'' (ترمذیؒ، نسائیؒ اور ابن ماجہؒ عن ابی ہریرہؓ) اسی طرح آپؐ کا فرمان مبارک یہ بھی ہے کہ موت کا تذکرہ اور قرآن کی تلاوت کثرت کے ساتھ کیا کرو چنانچہ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ ''انسانوں کے دلوں پر بھی زنگ لگ جایا کرتا ہے جیسے کہ لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے اگر اس پر پانی پڑتا رہے!'' اس پر جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم! یہ فرمائیے کہ پھر ان کو از سر نو جلا کیسے دی جائے؟'' تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''دو کام کثرت کے ساتھ کیا کرو: ایک موت کا ذکر اور دوسرے تلاوتِ قرآن!'' (سنن بیہقیؒ) لیکن آج کل کے ''مترفین'' یعنی مرفہ الحال لوگ اور اصحابِ دولت و ثروت موت کے ذکر کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ایک دوست نے جو پی آئی اے میں کام کرتے ہیں، یہ بتایا تھا کہ جب سعودی ائیر لائنز کے دیکھا دیکھی پی آئی اے کی پروازوں کے آغاز میں بھی سفر کی اس دعا کا اہتمام کیا جانے لگا جو قرآن حکیم میں وارد ہوئی ہے[1] تو بہت سے لوگوں نے باضابطہ احتجاج کیا اور زور دیا کہ اس دعا کا صرف پہلا حصہ پڑھا جائے، یعنی: ''سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَہٗ مُقْرِنِیْنَ''[2] لیکن دوسرا حصہ نہ پڑھا جائے جس میں موت کا تذکرہ ہے یعنی: ''وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ''[3] اس لیے کہ بقول ان کے، اس طرح تو پی آئی اے گویا پرواز کے آغاز ہی میں تمام مسافروں کو موت کی جھلک دکھا دیتی ہے، جس سے قلوب اور اعصاب پر ''منفی'' اثر پڑتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا الیہ راجعون!

[1] سورۃ الزخرف، آیات ۱۳، ۱۴

[2] ترجمہ: ''پاک ہے وہ ہستی جس نے ہمارے لیے اس (سواری) کو مسخر فرما دیا، ورنہ ہم تو ہرگز اس لائق نہ تھے کہ اس پر قابو پا سکتے!''

[3] ترجمہ: ''اور ہم سب بالآخر اپنے رب ہی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں!''

میں نے ابھی تک تو اس روایت کو بس ایک لطیفے ہی کے درجہ میں سمجھا تھا، لیکن حال ہی میں جب ایک اچھے بھلے معروف دانشور کی یہ بات سامنے آئی کہ قیامت کا ذکر منفی سوچ کا مظہر ہے تو ع ''ہمیں یقین ہوا، ہم کو اعتبار آیا!'' کے مصداق پہلی بات کا بھی ''حق الیقین'' حاصل ہو گیا۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پر صدمہ کی کیفیت زیادہ ہوئی یا حیرت اور تعجب کی کہ ایک مسلمان یہ بات کیسے کہہ سکتا ہے جب کہ قرآن مجید کا تو شاید کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہ ہو جس میں قیامت کا ذکر پورے شد و مد کے ساتھ نہ آیا ہو۔ بالآخر دل کو تسلی دی تو اس خیال کے ذریعے کہ شاید موصوف کی کسی لمبی تحریر کی تلخیص کسی صاحب نے کی ہو اور اس کی بناء پر یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم!

بہر حال، راقم الحروف اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اسے اس امر کا تو یقین کامل حاصل ہے ہی کہ قیامت آ کر رہے گی، جس کے نتیجے میں موجودہ عالم دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، بلکہ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ اس کا بھی ''حق الیقین'' حاصل ہے کہ اس کے کچھ عرصے کے بعد (جس کی مدت کا علم صرف اللہ کو ہے!) ایک نئے عالم یعنی عالم آخرت کی بساط بچھائی جائے گی۔ چنانچہ تمام انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور پھر حشر و نشر اور حساب کتاب کا معاملہ ہو گا، اور بالآخر جزا و سزا یعنی جنت یا دوزخ کے فیصلے صادر ہوں گے! جیسے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس نہایت ابتدائی دور کے خطبے میں وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا جو آپؐ نے اپنے پورے خاندان یعنی بنو ہاشم کے مجمع میں دعوتِ طعام کے بعد، اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے ہوئے دیا تھا کہ: ''وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ''[1] چنانچہ آپؐ کے الفاظِ مبارک یہ تھے:

''ترجمہ: ''خدا کی قسم، تم سب پر موت وارد ہو کر رہے گی جیسے کہ تم روزانہ رات کو سو جاتے ہو، پھر تم سب کو لازماً دوبارہ اٹھا لیا جائے گا''[1]

ترجمہ: ''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کرو!'' (سورۃ الشعراء، آیت: ۲۱۴)

جیسے کہ تم روزانہ صبح کو بیدار ہو جاتے ہو، پھر یقیناً تم سب سے حساب لیا جائے گا اس کا جو تم کر رہے ہو، اور پھر تمہیں لازماً بدلہ مل کر رہے گا، بھلائی کا بھلا اور برائی کا برا، اور وہ یا تو جنت ہو گی ہمیشہ کے لیے یا پھر دوزخ کی آگ ہو گی ہمیشہ کے لیے!'' (ماخوذ از ''نہج البلاغہ'')

البتہ اس قیامِ قیامت اور بعث بعد الموت کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین حاصل ہے کہ قیامت سے قبل پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین حق کا غلبہ اور خلافتِ علیٰ منہاج النبوّت کے نظام کا قیام لازماً واقع ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس کے مفصل دلائل بھی میں قرآن حکیم کی آیات سے ''دلالت'' کی بنیاد پر، اور احادیثِ نبویہؐ سے ''صراحت'' کی اساس پر دے چکا ہوں۔ اور ع ''سرمہ ہے میری آنکھ کا'' کے مصداق قرآن و حدیث ہی بندۂ مؤمن کی دو آنکھیں ہیں!

متذکرہ بالا دو امور کے بارے میں تو بحمد اللہ مجھے ''حق الیقین'' کی کیفیت حاصل ہے، البتہ اپنی ایک تیسری رائے کے ضمن میں مَیں صرف گمانِ غالب اور امید واثق کے الفاظ استعمال کرسکتا ہوں۔ (اگرچہ اس کی سرحدیں بھی ''یقین'' کے بالکل ساتھ جاملتی ہیں!) اور وہ یہ کہ غلبۂ دین حق اور قیام نظام خلافت کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت، ان شاء اللہ العزیز اسی ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق سرزمین افغانستان کو حاصل ہوگی جسے ماضی میں ''خراسان'' کہا جاتا تھا! میرے ''اس یقین کی حد کو پہنچنے والے گمان'' کی بنیاد جہاں بعض احادیثِ نبویہؐ بھی ہیں، جن کی بناء پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

''میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے!''

(مثلاً سنن ابن ماجہؒ کی حضرت عبداللہ ابن حارثؓ سے روایت ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مشرق کی جانب سے ایسے لوگ برآمد ہوں گے جو علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے مہدی کی مدد، یعنی ان کی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے پہنچیں گے''۔ اور جامع ترمذیؒ کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جس کے مطابق آنحضور صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: ''خراسان کے علاقے سے سیاہ جھنڈے برآمد ہوں گے اور انہیں کوئی طاقت واپس نہیں پھیر سکے گی، یہاں تک کہ وہ ایلیا یعنی بیت المقدس میں نصب کر دیئے جائیں گے'' (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم!) وہاں اس کی اصل اور محکم اساس گزشتہ چار سو سال کی تاریخ پر قائم ہے، جو گواہی دیتی ہے کہ پچھلی چار صدیوں کے دوران میں تجدید دین کا سارا کام برعظیم پاک و ہند میں ہوا اور اس عرصے میں تمام مجددین اعظم اسی خطے میں پیدا ہوئے..... جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشیتِ ایزدی اور حکمت خداوندی میں کوئی طویل المیعاد منصوبہ اس خطۂ ارضی کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر سب جانتے ہیں کہ سرزمین افغانستان کا ہمیشہ سے برعظیم پاک و ہند کے ساتھ یہ ''دوطرفہ تعلق'' قائم رہا ہے کہ تمام فاتحین تو افغانستان سے ہندوستان کی جانب آتے رہے، لیکن صرف ایک استثناء یعنی اسلام کی اوّلین آمد کے علاوہ تہذیب وتمدن، اور علم وحکمت کا سفر ہمیشہ ہندوستان سے افغانستان کی جانب رہا۔ چنانچہ ماضی میں بدھ مت بھی ہندوستان سے افغانستان گیا تھا، اور گذشتہ چار صدیوں کے دوران میں اسلام کی جملہ تجدیدی مساعی کے اثرات کے اعتبار سے بھی افغانستان برعظیم پاک و ہند کے ''تابع'' رہا۔ جس کی نہایت نمایاں مثال یہ ہے کہ اگرچہ مسلم فاتحین کے ساتھ تو سلسلۂ چشتیہ افغانستان سے ہندوستان آیا تھا، لیکن پھر الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کے اثرات کی صورت میں اوّلاً سلسلۂ مجددیہ پہلے افغانستان اور بھرپور ے ترکستان تک پہنچا اور پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے مدرسۂ فکر کا اثر ونفوذ بھی وسعت اور سرعت کے ساتھ ارضِ خراسان تک ممتد ہوگیا۔ اور اس وقت ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ سکتی ہے (بشرطیکہ اس میں قرآن اور حدیث کا ''سرمہ'' لگا ہوا ہو!) کہ ''وقت کے بہتے دریا'' نے ایک جانب برعظیم ہندوپاک کی پوری چار صدیوں کی تجدیدی مساعی کی وراثت ارضِ پاکستان میں جمع کر دی ہے، اور دوسری جانب ارضِ خراسان میں اللہ تعالیٰ نے سپر پاور زکی باہمی کشاکش کے ذریعے نہ صرف یہ کہ سوئی ہوئی مارشل اسپرٹ کو بیدار کر دیا ہے اور قدیم جذبۂ حریت کو مزید مہمیز دے دی ہے، بلکہ جذبۂ جہاد فی سبیل اللہ کو بھی قابل لحاظ حد تک قوی بنا دیا ہے۔ تو پھر کون سے تعجب کی بات ہوگی اگر تاریخ کی کوئی کروٹ ؎

''عطا مؤمن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی!''

کے مصداق ایک جانب سے مجددین ہند کا علم وحکمت اور فکر وفہم اور دوسری جانب سے مسلمانانِ افغانستان کا جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد دریائے سندھ اور دریائے کابل کے مانند باہم مل کر احیاء اسلام، غلبۂ دین اور عالمی نظامِ خلافت کے قیام کا نقطۂ آغاز بن جائیں۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ!

میری ان باتوں پر بھی کوئی ''دانشور'' اگر چاہے تو بڑی آسانی کے ساتھ کسی افیمی کے خواب یا مجذوب کی بڑ کی پھبتی چست کرسکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی خود میں بھی اس کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہوں کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

.....تاہم مجھے یہ اطمینان ہے کہ میری ان باتوں کو کم از کم ''منفی سوچ'' کی مظہر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

البتہ اس تیسری بات کے سلسلے میں دو سوالات کے جواب کے بارے میں نہایت متردد بھی ہوں اور ان میں سے ایک کے بارے میں میرا ایک اندیشہ بھی قوی سے قوی تر ہوتا چلا جا رہا ہے، جسے قنوطیت اور یاس پسندی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے اور منفی سوچ کا مظہر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن ''مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى''[1] کے مصداق میں اپنے حقیقی احساسات بیان کرنے پر مجبور ہوں۔

[1] ترجمہ: ''میں تمہیں وہی کچھ دکھا رہا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں!'' (سورۃ المؤمن، آیت: ۲۹)

ان دوسوالوں میں سے پہلاسوال تو یہ ہے کہ ''مَتٰی هُوَ؟'' [۲] کے مصداق غلبۂ اسلام کا یہ مرحلہ کب شروع ہوگا؟ اور دوسرا یہ کہ اگر اس کا آغاز پاکستان ہی سے ہونا ہے تو ''کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد؟'' کے مصداق آیا پاکستان میں دین حق کا کا غلبہ اور نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے، یا اس سے بھی عظیم تر سانحے اور حادثے کے بعد ہوگا، یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی ''رضا کارانہ توبہ'' کے ذریعے ہو جائے گا۔

۲ سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۵۱

جہاں تک ''مَتٰی هُوَ'' یعنی ''یہ کب ہوگا؟'' کا تعلق ہے، ہمیں قرآن حکیم سے بھی اس سوال کے دو جواب ملتے ہیں، چنانچہ پہلا جواب تو وہی ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کی اسی آیت (۵۱) میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے: ''قُلْ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ قَرِیْبًا'' یعنی ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دیجئے کہ عین ممکن ہے کہ وہ بالکل ہی قریب آ گیا ہو!'' بالکل اسی طرح کی ایک بات سورۃ المعارج میں بھی وارد ہوئی ہے: ''اِنَّهُمْ یَرَوْنَهٗ بَعِیْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِیْبًا'' یعنی ''یہ لوگ اسے دور سمجھ رہے ہیں، جب کہ ہم اسے بالکل قریب دیکھ رہے ہیں!'' (آیات: ۶، ۷) اور دوسرا وہ عمومی جواب ہے جو قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے، یعنی یہ کہ: ''قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ'' یعنی ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ قریب آ چکی ہے یا ابھی دور ہے!'' (سورۃ الانبیاء: ۱۰۹) اور ''قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا'' یعنی اور ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) کہہ دیجئے کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ عنقریب پیش آنے والی ہے یا ابھی میرا رب اس کے ضمن میں کچھ تاخیر فرمائے گا!'' (سورۃ الجن: ۲۵)

بہرحال سورۂ بنی اسرائیل کی محولہ بالا آیت کے مطابق میری رائے بھی یہی ہے کہ پہلے پاکستان اور افغانستان، اور پھر کل روئے ارضی پر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ اب زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ (اگرچہ دونوں مؤخر الذکر آیات کے مطابق اس کا حتمی علم صرف اللہ کو ہے) تاہم میرے تردد کی بنیاد یہ ہے کہ تاحال اس کے آثار کہیں دور دور تک بھی نظر نہیں آ رہے۔ بلکہ ہم بحیثیت قوم وملت روز بروز سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۷ میں واردان الفاظ کے زیادہ سے زیادہ مصداق بنتے چلے جا رہے ہیں: ''هُمْ لِلْكُفْرِ یَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِیْمَانِ'' (وہ اُس روز ایمان کے مقابلے میں کفر سے قریب تر تھے!) اور واقعہ یہ ہے کہ اگر میرے سامنے حیاتِ نبویؐ اور سیرت مطہرہ کا ایک خاص مرحلہ نہ ہوتا تو ع ''اڑتے اڑتے دور افق پر آس کا پنچھی ڈوب گیا!'' کے مصداق میری امید کب کی دم توڑ چکی ہوتی۔ اس لیے کہ میں بحمد للہ خوب اچھی طرح محسوس کر سکتا ہوں کہ سن دس نبویؐ میں جناب ابوطالب کے انتقال کے بعد عالم اسباب کے اعتبار سے مکہ مکرمہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے واحد امان اُٹھ گئی اور کفارِ مکہ کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی، چنانچہ آپؐ اپنی دعوت اور تحریک کے لیے کسی متبادل مرکز کی تلاش میں طائف تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں آپ ﷺ کو ایک دن میں وہ سختی جھیلنی پڑی جس کا سامنا اس سے قبل مکہ میں پورے دس سال کے دوران میں ذاتی طور پر آپؐ کو کبھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ واپسی پر آپؐ کی زبانِ مبارک پر وہ دلدوز فریاد بھی آئی جو حدیث اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہے، اور پھر اسی مایوسی کے عالم میں جب آپ مکہ واپس تشریف لائے تو سردارانِ قریش میں سے کسی کی امان حاصل کیے بغیر مکہ میں داخلہ ممکن نظر نہ آیا۔ چنانچہ دو اشخاص کی جناب سے آپ کی فرمائش کا کورا جواب ملنے کے بعد بالآخر ایک کافر ومشرک لیکن شریف النفس انسان مطعم بن عدی اپنے چھ ہتھیار بند بیٹوں کے ہمراہ مکہ سے باہر آیا اور آپؐ کے لیے اپنی امان کا اعلان کرتے ہوئے آپؐ کو ساتھ لے کر مکہ میں داخل ہوا..... تو اس وقت نہ آپؐ کی دعوت کے پنپنے کا کوئی امکان کسی کو نظر آ سکتا تھا، نہ آپؐ کی کامیابی کے لیے امید کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کرن کسی کو دکھائی دے سکتی تھی! اس کے باوجود کل دس سال کی مدت میں انقلابِ عظیم برپا ہو گیا، اور چشم گیتی نے وہ نظارہ دیکھ لیا کہ آپؐ ۱۰ رمضان المبارک سن ۸ ہجری کو اسی مکہ مکرمہ میں اپنے دس ہزار ساتھیوں کے جلو میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے، گویا اللہ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ چنانچہ صرف اسی کے فضل وکرم کے سہارے اور اسی کی قدرتِ کاملہ کی بنا پر میری یہ امید قائم ہے کہ ان شاء اللہ اسی سرزمین پاکستان وافغانستان سے اس عمل کا آغاز ہوگا جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر ع 'شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے' اور ع 'یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!'' کی کیفیت پیدا ہو کر رہے گی! (واضح رہے کہ مطعم بن عدی حالتِ کفر ہی میں فوت ہو گیا تھا، لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے احسان کا اس درجہ پاس تھا کہ آپؐ نے غزوۂ بدر کے بعد قریش کے ستر قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ''اگر آج مطعم زندہ ہوتا اور وہ ان کی سفارش کرتا تو میں ان سب کو بغیر کسی فدیئے اور تاوان کے رہا کر دیتا!'')

اس ''گمان غالب'' یا امید واثق (جس کی سرحدیں ''یقین'' سے جا ملتی ہیں) کے اظہار کے بعد کہ ''انشاء اللہ العزیز'' اسلام کے عالمی غلبے اور کل روئے ارضی پر نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کے قیام کا نقطۂ آغاز ارضِ پاکستان اور اس سے ملحق افغانستان کا وہ علاقہ بنے گا جو ماضی میں خراسان کہلاتا تھا۔ اب آیئے اس دوسرے سوال کی جانب جس کے جواب کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں بہت متردد ہوں، یعنی یہ کہ آیا پاکستان میں یہ عظیم انقلاب ''کسی سقوطِ مشرقی پاکستان جیسے یا اس سے بھی عظیم تر سانحے یا حادثے کے بعد ہوگا، یا اس سے قبل کسی خارجی افتاد کے بغیر ہی رضا کارانہ توبہ کے ذریعے ہو جائے گا؟'' تو واقعہ یہ ہے کہ اس کے بارے میں اپنے حقیقی احساسات اور خدشات کے اظہار اور انہیں نوکِ زبان یا نوکِ قلم پر لانے سے شدید خوف محسوس ہوتا ہے، اس لیے کہ تلخ حقائق کو تو تسلیم کرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے، کجا ان کا مواجہہ کرنا (یعنی انہیں ''Face'' کرنا) کہ وہ تو بہت ہی دل گردے کا کام ہے۔ جب کہ عام طور پر لوگوں کا طرزِ عمل اس روایتی کبوتر ہی کا ہوتا ہے جو بلی کو سامنے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ اس سے خطرہ تو نہیں ٹل جاتا اور

حقیقت تو نہیں بدل جاتی!) لہٰذا شدید اندیشہ ہے کہ میرے خیالات کو قنوطیت اور یاس پسندی سے تعبیر کیا جائے گا اور بہت سے دانشور انہیں ''منفی سوچ'' کا مظہر قرار دیں گے۔ تاہم ع' مجھے ہے حکم اذاں، لا الٰہ الا اللہ'! کے مصداق میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ہم بحیثیت ملک وقوم عذابِ الٰہی کے دوسرے اور شدید تر کوڑے کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ اور ؎

''ہم نے تو جہنم کی بہت کی تدبیر لیکن تری رحمت نے گوارا نہ کیا!''

کے مصداق ہم اپنے اعمال کے اعتبار سے تو ''عذاب اکبر'' کے قطعی مستحق ہو چکے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ اپنے خصوصی فضل وکرم کے طفیل ہمیں قومِ یونس علیہ السلام کی سی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ (اللہ سے دعا ہے کہ ایسا ہی ہو!)

کچھ عرصہ قبل انہی کالموں میں ''قرآن کا قانونِ عذاب'' کے موضوع پر مفصل گفتگو ہو چکی ہے، جس کے سلسلے میں سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ کا حوالہ بھی آیا تھا، جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ مستقل ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ وہ کسی قوم پر آخری ''عذاب استیصال'' سے قبل یعنی اس عذاب سے پہلے جس کے ذریعے اس کا نام ونشان مٹا دیا جائے، چھوٹے عذاب نازل فرماتا ہے تاکہ اگر وہ ہوش میں آسکتی ہے تو آجائے اور توبہ وانابت کی روش اختیار کر کے ''عذاب اکبر'' سے بچ جائے۔ مزید برآں اس عذاب استیصال کے بارے میں یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ چونکہ یہ صرف ان قوموں پر نازل کیا جاتا رہا ہے جن کی جانب اللہ کے رسول مبعوث ہو کر اتمام حجت کا حق ادا کر چکے ہوں،[1] لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رسالت کے سلسلے کے ختم ہو جانے کے بعد اس نوع کا عذاب کسی ''نئی'' قوم پر نہیں آئے گا۔

[1] سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۱۵ اور سورۃ القصص، آیت: ۵۹

بلکہ یہ حتمی اور کلی طور پر صرف سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود پر آئے گا جو اوّلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو ان کی جانب مبعوث کئے گئے تھے رد کرنے کی باعث اس کے مستحق ہو گئے تھے، اور ثانیاً جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے وقت انہیں ایک ''رحم کی اپیل'' کا موقع[2] دیا گیا تو اسے بھی ضائع کرنے کے باعث حتمی اور قطعی طور پر ذلت ومسکنت، لعنت خداوندی اور غضب الٰہی کے مستوجب ہو گئے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ، جیسے کہ اس سے قبل تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے ان کی اس آخری اور ''استیصالی'' سزا کی تنفیذ اس لیے مؤخر کر دی گئی کہ موجودہ امت مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب پر عذاب اس مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں نازل کیا جائے تاکہ درد والم پر توہین وتذلیل کا اضافہ ہو جائے۔ (جس کا آغاز پینتالیس سال قبل یعنی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے وقت سے ہو چکا ہے اور جس میں ''کتاب الملاحم'' میں وارد شدہ پیشینگوئیوں کے مطابق مستقبل میں حد درجہ شدت پیدا ہونے والی ہے!)

[2] سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۷ و ۸

رہی موجودہ امت مسلمہ یعنی امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو اس پر کلی اور مجموعی حیثیت سے تو یہ نام ونشان مٹا دینے والا عذاب ہرگز نہیں آسکتا، اس لیے بھی کہ یہ آخری امت ہے اور اسے تا قیامِ قیامت باقی رہنا ہے۔ (جیسے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں آخری رسول ہوں اور تم آخری امت ہو!'') اور اس لیے بھی کہ اس کا اصل جرم بے عملی یا بدعملی ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار نہیں! تاہم اس بے عملی وبدعملی اور بدعہدی وبیوفائی کی پاداش میں کسی مخصوص خطے اور علاقے سے اس کا نام ونشان مٹا دیا جانا ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے۔ چنانچہ ہسپانیہ کی تاریخ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ سرزمین جس پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی، وہاں سے ع'' مٹے نامیوں کے نشان کیسے کیسے!'' کے مصداق اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان مٹے پورے پانچ سو برس ہو گئے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَار!

ان سطور کے ناچیز راقم نے اب سے ساڑھے چھ سال قبل (جنوری ۸۷ء میں) اپنی تالیف ''استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ'' شائع کی تو اس کے ذیلی سرورق پر یہ الفاظ تحریر کیے تھے:

''۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء میں اسلام بیک وقت برِّعظیم ہند میں براستہ سندھ، اور براعظم یورپ میں براستہ سپین داخل ہوا تھا۔ سپین سے اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہوئے پانچ سو برس ہو چکے ہیں۔ کیا اب وہی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی جانے والی ہے؟ ؎

''آگ ہے، اولادِ ابراہیم ؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے؟''

.....اور آج راقم گہرے درد ورنج کے ساتھ یہ عرض کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہا ہے کہ ان ساڑھے چھ سالوں کے دوران وقت کے دریا میں جو مزید پانی بہہ گیا ہے، اس کے نتیجے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پوری برِّعظیم پاک وہند میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں!

اس لیے کہ ایک جانب اس تلخ حقیقت سے اختلاف کی کسی بھی شخص کے لیے ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے کہ ہم نے ۱۹۷۱ء کے ''عذابِ ادنیٰ'' سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اور ڈھاکہ کے سقوط، ملک کے دولخت ہونے، مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں قلب ماہیت، اور ان سب پر مستزاد ان ہندوؤں کے ہاتھوں شرمناک اور ذلت آمیز شکست اور ترانوے ہزار مسلمانوں کی اسیری جن پر کہیں چھ سو، کہیں آٹھ سو اور کہیں ایک ہزار برس تک حکومت کی تھی (جس پر اندرا گاندھی کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ ''ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا لیا ہے!'') کے نتیجے میں نہ ہماری قومی اور اجتماعی روش میں کوئی تبدیلی آئی، نہ ہی افراد کی ترجیحات یا مشاغل میں سرمو فرق واقع ہوا، بلکہ بحیثیتِ مجموعی ہم پر اعتبار سے زوال اور اضمحلال ہی کی جانب رواں دواں ہیں۔ چنانچہ ہمارا داخلی انتشار ہے کہ روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے، تا آنکہ حالیہ سیاسی بحران کے دوران میں بعض دوسرے سیاسی اور قومی رہنماؤں کے اسی نوع کے بیانوں کے علاوہ خان ولی خان کا یہ ''عریاں'' بیان بھی شائع ہو چکا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ختم ہو چکا ہے!'' اسی طرح معیشت ہے کہ تباہی کے آخری کنارے کو پہنچا چاہتی ہے۔ قوم کے منتخب نمائندوں کو اب ''بکاؤ گھوڑوں'' سے بڑھ کر ''لوٹوں'' کا نام دیا جا رہا ہے۔ حالیہ چپقلش کے ضمن میں صدرِ مملکت کو سرِ عام گالیاں دی گئیں اور ان کے نت نئے کارٹون اور کیری کیچر شائع ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر عدلیہ پر کھلے بندوں فقرے چست کیے گئے، حتیٰ کہ اعلیٰ عدالتوں پر پتھراؤ بھی ہوا۔ الغرض واقعتاً ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہم قومی اور ملکی اعتبار سے ؎

''اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارِ ساز
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نوں!''

کی حد کو پہنچ چکے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ دنیا دو سپر پاورز کی کشاکش کی آماجگاہ ہونے کی بجائے ایک ''سول سپریم پاور'' کے حیطۂ اقتدار میں آ چکی ہے۔ چنانچہ اب کمزور قوموں اور چھوٹے ملکوں کے Options بہت محدود ہو چکے ہیں۔ اور اِدھر ہم جس کی دوستی کا دم بھرتے رہے اور جس کی حمایت کے سہارے جیتے رہے بلکہ جس کے گھڑے کی مچھلی بنے رہے (یعنی امریکہ)، وہ نہ صرف یہ کہ ع ''آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند!'' کا مصداق کامل بن گیا ہے۔ بلکہ اب ہر اعتبار سے بھارت کو ترجیح دینے کی پالیسی کے ناطے ع ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!'' کا مظہرِ اتم بن گیا ہے اور صرف ہمارے لیے ہی نہیں، پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے خطرناک ترین اور خوفناک ترین امر یہ ہے کہ اس ''سول سپریم پاور آن ارتھ'' کی پالیسیوں کی تشکیل اور فیصلوں کی تعیین میں یہودیوں کو فیصلہ کن اثر و نفوذ حاصل ہے، جس کے نتیجے میں ''نیو ورلڈ آرڈر'' فی الواقع ''جیو ورلڈ آرڈر'' بن گیا ہے!

تیسری جانب بھارت میں متعصب ہندو ذہنیت کا جارحانہ احیاء ہے جس کی شدت نے دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی صورت اختیار کر لی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لگ بھگ پچیس برس تک بھارت میں ہندومت کے احیاء کے کوئی آثار نہیں تھے، بلکہ بھارت کی سیاسی اور سماجی زندگی پر انڈین نیشنل کانگریس کو فیصلہ کن غلبہ حاصل تھا جس میں اگرچہ متعصب اور کٹر ہندو بھی یقیناً شامل تھے، تاہم اس کی قیادت میں فیصلہ کن عمل دخل سیکولر مزاج کے حامل لوگوں کو حاصل تھا۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کے باعث اس کے رعب اور دبدبے میں جو کمی آئی اس سے بھارت میں عوامی سطح پر ہندو قوم پرستی کے جذبے کو تقویت ملی اور نہ صرف بھارت میں ہندو راشٹر کے قیام بلکہ پراچین بھارت کی عظمتِ رفتہ اور سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کی امنگ پیدا ہوئی۔

اس جلتی پر تیل کا کام اس حادثے نے کیا کہ جب اسی کی دہائی کے آغاز میں جبری نس بندی کے ردِّعمل میں مسلمان ووٹ بحیثیت مجموعی کانگریس کے خلاف پڑا تو اس پر ''جوابِ آں غزل'' کے انداز میں اگلے انتخابات میں اندرا گاندھی نے ''ہندو دیوی'' کا روپ دھار کر خالص ہندو ووٹ کے ذریعے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ اور اس طرح بھارت میں ریاستی اور حکومتی سطح پر اور بالخصوص ذرائع ابلاغ کی وساطت سے ہندو فنڈامنٹلزم کو فروغ حاصل ہوا، جس کا نتیجہ سامنے ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) جو راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے سیاسی فرنٹ کی حیثیت رکھتی ہے، بھارت میں عظیم قوت بن کر ابھری ہے اور پوری ہندی بیلٹ (راجپوتانہ، ہریانہ، اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور گجرات) میں تو غالب سیاسی طاقت بن ہی چکی ہے، اب جنوبی بھارت میں بھی قدم جمانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اِدھر خود آر ایس ایس کا حال یہ ہے کہ ایک جانب اب سے لگ بھگ دس برس قبل شکاگو سے جو ایک ضخیم تصنیف اس کے بارے میں "Brotherhood in Saffrom" کے نام سے شائع ہوئی تھی، اس میں اس کے تربیت یافتہ کارکنوں کی تعداد پچیس لاکھ بتائی گئی تھی۔ (اس پر اس عرصے میں جو اضافہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ خود لگا لیجئے!) دوسری جانب اس کی مستقل مزاجی کا عالم یہ ہے کہ ستر برس کے لگ بھگ عرصہ اس کے قیام کو ہونے کو آیا لیکن اس نے کبھی انتخابات میں شریک ہو کر ''پاور پالیٹکس'' میں وقت ضائع کرنا ہرگز گوارا نہیں کیا، بلکہ ساری توجہ کو پوری تندہی کے ساتھ اپنے کارکنوں کی تنظیم، تربیت اور سماجی خدمت کے کاموں پر مرکوز رکھا، (واضح رہے کہ یہ جماعت قائم بھی خاکسار تحریک کے ردِّعمل ہی میں ہوئی تھی) اور تیسری جانب اس کے کارکنوں کے نظم و ضبط کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دسمبر ۹۲ء کے پہلے ہفتے میں ان کے تین لاکھ کارکن بابری مسجد کو گرانے کے لیے ایودھیا میں جمع ہوئے، اور ظاہر ہے کہ وہ بھارت کے کونے کونے سے طویل سفر طے کر کے آئے تھے، لیکن مسجد کے شہید کیے جانے تک کہیں ان کے کارکنوں کے مشتعل ہو کر کسی مسلمان کی جان، مال، یا عزت پر ہاتھ ڈالنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ چنانچہ اب بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور مستقل

کے اندیشوں کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ شنید ہے کہ اس عظیم تنظیم کے رہنما (گورو) دیورس نے حال ہی میں ایک گشتی مراسلہ بھارت کی تمام ہندو سیاسی، سماجی اور مذہبی تنظیموں کو ارسال کیا ہے جس میں واضح طور پر کیا گیا ہے کہ:

''اب ہمیں بھارت کی پاک زمین سے مسلمانوں کی نجاست کو حتمی طور پر ختم کرنے کا آخری فیصلہ کر گزرنا چاہئے۔ اور میں آپ سب کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس پر کچھ معمولی سا ردعمل پاکستان اور بنگلہ دیش میں تو ہوسکتا ہے، جس کی ہمیں پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں، باقی پوری دنیا کے مسلمانوں سے کسی ناموافق ردعمل کا کوئی اندیشہ نہیں ہے!''

اندریں حالات بھارت کا مسلمان تو مسلسل خوف کی حالت سے دوچار ہے ہی (اس لیے کہ اسے تو مسلسل یہ نعرہ سننا پڑتا ہے کہ ''مسلمان کے دو استھان: پاکستان یا قبرستان!'') لیکن جگر کے اس شعر کے مصداق کہ: ؎

''آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں!''

ہم مسلمانانِ پاکستان کو بھی کسی مغالطے میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ اس لیے کہ ایک جانب بھارت کے ہندو فنڈامنٹلزم کا علاقائی عملداری کا دعویٰ انڈونیشیا سے افغانستان تک، معاشی استحصال کی امنگیں اس سے بھی آگے ایران و عرب تک اور بحری بالادستی کا عزم پورے بحر ہند پر یعنی آسٹریلیا سے افریقہ تک ہے۔ اور دوسری طرف بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ اور ہنود و یہود کا اشتراکِ عمل بڑی تیزی کے ساتھ رسمی اور روایتی سفارتی تعلقات سے بہت آگے بڑھ رہا ہے! اور اسرائیل اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے توسیعی عزائم یعنی عظیم تر اسرائیل کے قیام کی راہ میں واحد مسلمان ملک جو مزاحم ہوسکتا ہے وہ صرف پاکستان ہے، جس کے ایٹمی دانت یا نکل چکے ہیں یا نکلنے کا اندیشہ ہے! اور تیسری جانب امریکہ وسطی ایشیا کی نوآزاد مسلمان ریاستوں کے سیاسی، معاشی یہاں تک کہ سماجی روابط بھی مغرب میں اسرائیل اور سیکولر ترکی اور مشرق میں بھارت کے ساتھ استوار کرانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ الغرض، ان جملہ داخلی و خارجی عوامل کا ''حاصل جمع'' اقبال کے الفاظ میں یہ ہے کہ ع ''تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمان میں!'' اور ہم بحیثیتِ ملک و قوم اس وقت بالکل اسی صورت حال سے دوچار ہو چکے ہیں، جس کے پیش نظر بخت نصر کے ہاتھوں عظیم سلطنت اسرائیل اور مقدس شہر یروشلم کی کامل تباہی سے قبل انبیاء بنی اسرائیل اپنی قوموں کو ان الفاظ میں متنبہ کرتے رہے تھے کہ: ''ہوش میں آجاؤ، ورنہ جان لو کہ درخت کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا جاچکا ہے!''

۲۰/ جولائی ۱۹۹۳ء

باب پانزدھم

ہماری نجات کا واحد ذریعہ

اجتماعی توبہ

جو کچھ گذشتہ صحبت میں عرض کیا گیا تھا اس کے پیشِ نظر اس انگریزی مقولے کے مطابق کہ ''امید تو بہترین کی کرو، لیکن تیار بدترین کے لیے رہو!'' اس خطۂ ارضی کے مستقبل کے بارے میں، جس میں پاکستان واقع ہوا ہے، بہترین سے بدترین تک تین ممکنہ صورتیں نظر آتی ہیں:

پہلی صورت جو نہایت خوش آئند اور تابناک ہے یہ کہ ؎

''پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!''

کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان کو قومِ یونسؑ کی سی توبہ کی توفیق مل جائے۔ چنانچہ اوّلاً افراد و اشخاص کی ایک معتد بہ تعداد اللہ کے حضور میں سچی اور خالص توبہ کرے اور ایک جانب اپنے عقائد کی تصحیح کرے اور توحید خالص کا دامن از سرِ نو مضبوطی کے ساتھ تھامے، دوسری جانب فسق و فجور کو ترک کرے اور اپنی معیشت اور معاشرت کو حرام اور منکر سے پاک کرے، اور تیسری جانب غلبۂ اسلام اور قیامِ نظامِ خلافت کی منظّم جدوجہد کے لیے تن من دھن وقف کر دے۔ ثانیاً اس طرح جو منظّم قوت وجود میں آئے وہ ملکی سیاست اور اقتدار کی کشاکش سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے اپنی جملہ مساعی اور تمام تر توانائیوں کو مزاحمتی تحریک کے لیے وقف کر دے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں فطری تدریج کے ساتھ ''باللِّسان'' یعنی زبان اور نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع سے تدریجاً آگے بڑھ کر ''بالیَد'' یعنی قوت کے ساتھ مزاحمت کی راہ اختیار کرے۔ اور اس طرح ارضِ پاکستان پر اللہ کے دین کو غالب اور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو نافذ کر دے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ نہ صرف یہ کہ قیامِ پاکستان کے لیے جو قربانیاں مسلمانانِ ہند نے دی تھیں وہ رائیگاں نہیں گئیں، بلکہ الف ثانی کی جملہ چار سو سالہ تجدیدی مساعی بھی بارآور ہو گئیں۔ اس لیے کہ اس صورت میں ارضِ پاکستان کو فوری طور پر اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا گہوارہ اور عالمی غلبۂ اسلام کا نقطۂ آغاز بننے کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اب ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کی دلی خواہش بھی یہی ہو گی کہ ایسا ہو جائے، اور اسی کی دعا بھی ہر قلب کی گہرائی سے بلند ہو گی۔ اور ''جب تک سانس تب تک آس!'' کے مطابق ہمیں آخری دم تک کوشش بھی اسی کی کرنی چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس کے کچھ ناگزیر لوازم و شرائط ہیں جن کا اجمالی ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے اور کسی قدر وضاحت سے آگے دوبارہ ہو گا۔

دوسری ممکنہ صورت یہ ہے کہ چونکہ سرزمین مشرقی پاکستان ہم مغربی پاکستان کے رہنے والوں کی نگاہوں سے دور تھی، اور ''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ۱۹۷۱ء کے ''عذابِ ادنیٰ'' کے شدائد کو ہم نے براہِ راست محسوس نہیں کیا، لہٰذا شاید کہ ہماری آنکھیں کھولنے اور ہمیں توبہ اور رجوع پر آمادہ کرنے کے لیے ایک مزید ''عذابِ ادنیٰ'' کی ضرورت ہو۔ چنانچہ جس عذاب کے سائے افق پر منڈلاتے نظر آ رہے ہیں وہ عذابِ ادنیٰ ہی کا ایک اور کوڑا ہو۔ اور اگرچہ اقبال کا یہ شعر کہ ؎

''اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا!''

تا حال ترکوں پر تو صادق نہیں آ سکا، لیکن کیا عجب کہ ہم پر صادق آ جائے۔

تیسری اور آخری، اور حد درجہ قابلِ حذر صورت، جو بحالاتِ موجودہ ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے، یہ ہے کہ، خاکم بدہن، ہمیں اپنے کرتوتوں اور فروگزاشتوں کی پاداش میں اپنے کسی دشمن کے ہاتھوں عبرتناک سزا دلوائی جائے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ (قرآن کے الفاظ کے مطابق) ہمارے حلیے بگڑ جائیں[1] بلکہ اس علاقے کا جغرافیہ ہی بدل جائے اور عظیم سلطنت عثمانیہ اور عظیم سوویت یونین کے مانند، اور ع ''تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!'' کے مصداق ''سلطنتِ خداداد پاکستان'' کا نام و نشان بھی دنیا کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے!

اللہ نہ کرے ایسا ہو، اور اگرچہ قرائن اور شواہد کے اعتبار سے تو اب معاملہ ایک انگریزی محاورے کے مطابق ''امید کے خلاف امید'' (Hoping Against Hope) کا ہے، تاہم مجھے اب بھی امید ہے کہ انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔

لہ ﴿لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ﴾ (بنی اسرائیل:۷)

لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تب بھی میری یہ ''امید واثق'' اپنی جگہ برقرار رہے گی کہ عالمی غلبۂ اسلام اور کل روئے ارضی پر نظامِ خلافتِ علیٰ منہاج النبوت کا قیام، جو تقدیر مبرم کے مانند اٹل ہے، اسی خطۂ ارضی سے شروع ہوگا۔ اس لیے کہ ؎

''ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!''

کے مصداق تاریخ اپنے آپ کو دہرا سکتی ہے۔ اور جس طرح اب سے لگ بھگ سات آٹھ سو سال قبل اللہ تعالیٰ نے عربوں کو تاتاریوں کے ہاتھوں پٹوایا، اور پھر خود ان کو اسلام کی توفیق عطا کر کے عالم اسلام کی قیادت سونپ دی، اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہمارا کوئی دشمن ہمیں فتح کر لے لیکن پھر خود اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو جائے! اس لیے کہ بعض ایسے حضرات جن کی نگاہ ایک جانب تاریخ اور رفتارِ زمانہ پر بھی ہے، اور دوسری جانب قرآن اور دیگر کتبِ سماویہ کے علاوہ ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں پر بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کی قیادت جواوّلاً عربوں کو عطا کی گئی تھی، جو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حضرت سام کی نسل سے تھے، پھر ترکوں کو منتقل کر دی گئی تھی، جو حضرت نوح علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت یافث کی نسل سے تھے اور اب جنوبی ایشیا کے ان لوگوں کو منتقل ہونے والی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے تیسرے بیٹے یعنی حضرت حام کی نسل سے ہیں۔ واللہ اعلم!

بہرصورت، جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا، ہمارا فرض یہ ہے کہ ؎

''سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے!''

کے مصداق دامن امید کو حتی الامکان مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھنے کی کوشش کریں، اور ع 'پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!'' کے مطابق چمن پاکستان میں ''چمن سے روٹھی بہار'' کو واپس لانے کی ہر ممکن سعی کریں اور اس سلسلے میں قوم یونس علیہ السلام کی مثال ہمارے لیے بہت ہمت افزا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس علیہ السلام کی آیات ۹۶ تا ۹۸ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا مستقل قانون تو یہی ہے کہ جس طرح کسی انسان پر موت کے آثار شروع ہو جانے کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی قوم پر آخری اور بڑے عذاب کے آثار شروع ہونے کے بعد اس کے ایمان لانے یا توبہ کرنے سے عذاب نہیں ٹالا جاتا، لیکن اس قاعدۂ کلیہ میں ایک استثناء کا معاملہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ ہوا کہ ان کی توبہ عذاب استیصال کے آثار شروع ہونے کے بعد بھی قبول کر لی گئی۔ تو اگرچہ قوم یونس علیہ السلام کے ضمن میں تو اس استثناء کا سبب کچھ اور تھا، تاہم چونکہ ہم پر فی الوقت کسی رسول کے ذریعے اتمام حجت نہیں ہوا ہے، لہٰذا ہم بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری سے استغاثہ کرنے کے مستحق ہیں، اور توقع کر سکتے ہیں کہ اگر ہم سچی توبہ (توبۂ نصوح) کا حق ادا کر دیں تو آنے والا عذاب ٹل سکتا ہے۔

البتہ کسی قوم کو دنیا میں اس ''رسوا کن عذاب'' سے نجات پا کر ایک نئی ''مہلتِ حیات'' کی حقدار قرار دینے والی ''توبہ'' کے کچھ لوازم و شرائط ہیں جن کا فہم و ادراک ضروری ہے:

۱) اوّلاً یہ کہ اگرچہ ''اجتماعی توبہ'' کا نقطۂ آغاز لامحالہ انفرادی توبہ ہی ہوتی ہے، لیکن انفرادی توبہ کے ذریعے صرف اخروی عذاب سے نجات کی ضمانت مل سکتی ہے، اور وہ بھی صرف اس صورت میں کہ وہ واقعی ''توبۂ نصوح'' ہو جس کی آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہؐ کی روشنی میں جو شرائط معین کی گئی ہیں وہ حقوق اللہ کے ضمن میں ہونے والی تقصیرات کے معاملے میں تو تین ہیں، لیکن حقوق العباد سے متعلق گناہوں کے معاملے میں چار ہیں۔ یعنی ان دونوں قسم کے گناہوں کے ضمن میں تو یہ تین شرائط مشترک ہیں کہ: (i) ایک یہ کہ حقیقی اور واقعی ندامت موجود ہو، بقول اقبال: ؎

''موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے!''

(ii) دوسرے یہ کہ آئندہ کے لیے عزم مصمم ہو کہ اس گناہ کا ارتکاب کبھی نہیں کروں گا۔ اور (iii) تیسرے یہ کہ بالفعل بھی اس گناہ کو واقعتاً ترک کر دے۔ اور ان پر مستزاد حقوق العباد کے ضمن میں ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ شخص متعلق کا جو حق تلف یا غصب کیا تھا اس کی تلافی کرے، یا بصورتِ دیگر اس سے معافی حاصل کرے! (ورنہ قیامت کے دن حساب کتاب کے وقت ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جائیں گی یا مظلوم کی برائیاں ظالم کے حساب میں شمار ہوں گی۔)

۲) یہ ''انفرادی توبہ'' خواہ کتنی ہی سچی ہو اور انسان ذاتی اعتبار سے خواہ کتنا ہی متقی وصالح، اور عابد وزاہد کیوں نہ بن جائے، اگر قوم کی مجموعی حالت تبدیل نہ ہو اور وہ بحیثیت مجموعی عذابِ خداوندی کی مستحق بن جائے تو جس طرح چکی میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے، اسی طرح جب کسی قوم پر دنیا میں اجتماعی عذاب آتا ہے تو اس کی لپیٹ میں بدکاروں اور بدمعاشوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگ بھی آجاتے ہیں، جیسے کہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۵ میں فرمایا:

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

''اور ڈرو اس عذاب سے جو تم میں سے صرف بدکاروں اور گناہ گاروں ہی پر نہیں آئے گا، اور جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے!''

اس قاعدۂ کلیہ میں بھی ایک استثناء موجود ہے جس کا ذکر آگے آرہا ہے).....اس سے بھی زیادہ قابل حذر معاملہ وہ ہے جو ایک حدیثِ مبارک میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں اور فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت الٹ دو۔ اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ پروردگار! اس میں تو تیرا فلاں بندہ بھی رہتا ہے جس نے آج تک کبھی پلک جھپکنے جتنی دیر بھی معصیت میں بسر نہیں کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: الٹ دو اس بستی کو پہلے اس پر اور پھر دوسروں پر، اس لیے کہ (اپنی تمام تر ذاتی نیکی اور پارسائی کے باوصف، اس کی دینی بے حمیتی کا حال یہ ہے کہ میرے دین وشریعت کی حمایت وحفاظت میں کوئی عملی سعی وجہد تو درکنار) میری غیرت کے باعث کبھی اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر نہیں ہوا!'' (سنن بیہقیؒ)

۳) دنیا میں کسی قوم کے اللہ کے عذاب سے بچنے کی واحد صورت ''اجتماعی توبہ'' ہے اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں کسی معاشرے کے صدفی صد لوگ تو کسی بھی دور میں درست نہیں ہوئے۔ (یہاں تک کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی آخر دم تک کچھ نہ کچھ تعداد میں منافق ضرور موجود رہے، تا بہ دیگراں چہ رسد؟) تاہم اگر کسی قوم کے افراد اتنی معتد بہ تعداد میں سچی توبہ کرلیں کہ پھر اپنی دعوت ونصیحت، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعے قوم کے اجتماعی دھارے کا رخ تبدیل کردیں، یعنی بالفاظِ دیگر ایک اجتماعی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوجائیں، تو اس قوم کی جانب سے ''اجتماعی توبہ'' کا حق ادا ہوجائے گا، اور وہ ''دنیا کی زندگی میں رسوا کن عذاب'' سے نجات پاکر ''نئی زندگی'' حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

۴) چنانچہ کسی قوم پر اجتماعی عذاب نازل ہونے کی صورت میں اس کے نیک اور صالح افراد کے بچالیے جانے کی وہ واحد استثنائی صورت جس کا ذکر اوپر کیا گیا تھا، اور جس کی امید قرآن حکیم میں سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶۵ میں دلائی گئی ہے، یہی ہے کہ قوم کے اجتماعی فساد کی صورت میں جو لوگ آخر دم تک ''نهی عن السُّوء'' کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہیں، اور گویا سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ کے ان الفاظِ مبارکہ کے مصداق بن جائیں: ﴿''اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ (یعنی ''توبہ کرنے والے، بندگی کا حق ادا کرنے والے، اللہ کی حمد کرنے والے، لذاتِ دنیوی سے کنارہ کش رہنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کے محافظ بن کر کھڑے ہوجانے والے'').....تو اگر ان کی جملہ مساعی کے باوجود قوم بحیثیت مجموعی صحیح رخ پر نہ آئے اور اعراض واستکبار ہی پر مصر رہنے کے باعث عذابِ الٰہی کی مستحق ہوجائے تو اللہ اپنے ایسے ''نہی عن المنکر'' کا حق ادا کرنے والے بندوں کو دنیا کے رسوا کن عذاب سے بچا کر اپنے دامن رحمت میں لے لیتا ہے۔

۵) کسی مسلمان فرد یا قوم میں بے عملی یا بدعملی کا اصل سبب یقین والے ایمان کی کمی یا فقدان ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا اعلاج بھی ع ''علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!'' کے مصداق یہی ہے کہ اقبال کے اس قول کے مطابق کہ

''یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!''

امت میں یقین والا ایمان از سرِ نو پیدا کیا جائے۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم نے اس طرح تعبیر فرمایا کہ توبہ گویا از سرِ نو ایمان لانے کا کام ہے جس کا لازمی نتیجہ عمل کی اصلاح ہے۔[1]

[1] از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔ (الفرقان: ۷۰)
''سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کی، اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے بالفعل اچھے عمل کیے، تو اللہ ان کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا!''

لہٰذا قوم کی ''اجتماعی توبہ'' کے لیے اصل اور بنیادی ضرورت یہ ہے کہ تجدید ایمان کی عمومی تحریک برپا کی جائے، اور الحمدللہ کہ برعظیم پاک وہند میں ایک بڑے پیمانے اور عوامی سطح پر، اگرچہ غیر علمی اور غیر فکری انداز میں، تجدید ایمان کی ایک عظیم تحریک ''تبلیغی جماعت'' کے تحت چل بھی رہی ہے، تاہم ضرورت ہے کہ امت کے ذہین اور فہیم عناصر میں ایسے شعوری ایمان کی افزائش کا سامان کیا جائے جس کا گہرا اور محکم رشتہ ان کے ''فکر'' کے ساتھ قائم ہو، اس لیے کہ اس کے بغیر قوم کی اجتماعی صورت حال کا بدلنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے

احساس کے تحت علامہ اقبال نے اب سے لگ بھگ ساٹھ برس قبل ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے اپنے مشہور زمانہ ''خطبات'' ارشاد فرمائے تھے، اور اسی ضرورت کے احساس کے تحت اب سے لگ بھگ تیس سال قبل حضرت علامہ ہی کے ایک ادنیٰ خوشہ چین کی حیثیت سے راقم الحروف نے ''رجوع الی القرآن'' کی تحریک شروع کی تھی۔ اس لیے کہ وہ بات جو مولانا ظفر علی خاں مرحوم نے نہایت سادہ الفاظ میں کہی تھی، یعنی ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

وہ فی الواقع ایک نہایت عظیم حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے امت مسلمہ کے جملہ امراض کا اصل سبب قرآن سے دوری کو قرار دیا اور اس کا اصل علاج ''رجوع الی القرآن'' تجویز کیا۔ چنانچہ سادہ ترین الفاظ میں تو ''جوابِ شکوہ'' میں ارشاد فرمایا: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور نہایت پرشکوہ الفاظ میں ان فارسی اشعار میں بیان کیا کہ ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

اور ؎

اے چو شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندہ!

یعنی ''اے امت مسلمہ! تو درحقیقت تو خوار اور زبوں حال صرف اس لیے ہوئی کہ قرآن حکیم سے اپنا تعلق توڑ بیٹھی۔ گردشِ دوراں کے شکوے خواہ مخواہ کر رہی ہے۔ اے وہ قوم جو شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہے (چنانچہ اغیار و اعداء تجھے پامال کر رہے ہیں) اب بھی اس ''کتاب زندہ'' کی جانب رجوع کر لے جو تیری بغل میں موجود ہے (تو تیرے تمام امراض وعلل کا مداوا ہو جائے گا اور جملہ مسائل حل ہو جائیں گے۔'') گویا جس طرح جبران خلیل جبران نے کہا تھا: ''عقل سے روشنی حاصل کرو، اور جذبہ کے تحت حرکت کرو!'' اسی طرح ہماری ''اجتماعی توبہ'' کا نسخہ یہ ہے کہ: ''قرآن سے ایمان حاصل کرو، اور ایمان کے روغن سے جہد و عمل کی شمعیں روشن کرو!''

۶) ایمانِ حقیقی کے لازمی اور منطقی نتیجے کو قرآن اکثر و بیشتر تو صرف ''عمل صالح'' کی نہایت جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے لیکن کہیں اس کے مضمرات اور متضمنات کو کھول بھی دیتا ہے۔ جیسے سورۃ العصر میں عمل صالح کے دو لوازم کو نمایاں طور پر بیان کر دیا، یعنی ''حق کی علمبرداری اور دعوت و اشاعت'' اور ''باہم ایک دوسرے کو صبر و مصابرت کی تلقین و نصیحت۔'' اور اس طرح گویا ضمنی طور پر ایک جماعتی زندگی کی اہمیت کو بھی اجاگر کر دیا۔ اسی طرح کہیں قرآن ایمان کے جملہ عملی تقاضوں کو صرف ایک جامع اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے تعبیر فرما دیتا ہے، تو کہیں اس کی تفصیل دس اصطلاحات کے ذریعے کرتا ہے، جیسے کہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ میں تو وہ نو اوصاف بیان ہوئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اور اس سے قبل آیت ۱۱۱ میں اضافی اصطلاح ''قتال فی سبیل اللہ'' کے ذریعے ''تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ'' کے مصداق دس اوصاف کی تکمیل فرما دی۔ اس معاملے میں بھی اس حقیقت کا اعتراف و اظہار ضروری ہے کہ بحمد اللہ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۲ میں بیان شدہ نو اوصاف میں سے بھی پہلے سات کا اہتمام تو بعض تصوف کے حلقوں کے علاوہ تبلیغی جماعت کے احباب بھی کر رہے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ؎

''نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیریؓ
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری!''

کے مصداق یہ سب حضرات آخری دو اوصاف یعنی ''بدی سے روکنے اور حدود اللہ کے محافظ بن کر کھڑے ہو جانے'' کا بھی اہتمام کریں اور پھر اگر ''نہی عن المنکر باللّسان'' سے آگے بڑھ کر ''نہی عن المنکر بالیَد'' کی عوامی تحریک کا مرحلہ بھی آ جائے اور ضرورت داعی ہو تو نقد جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اور اللہ کے دین کی غیرت و حمیت، اور حمایت و محافظت میں جانیں قربان کر دینے ہی کو حاصل زندگی اور مقصد حیات سمجھ کر میدان میں آ جائیں، اور اس طرح ''اجتماعی توبہ'' کا وہ حق ادا کرنے کی کوشش کریں جو اس عذابِ الٰہی کے سایوں کو دور فرما دے جو وطن عزیز کے افق پر گہرے سے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے..... آمین!

۲۶ر جولائی ۱۹۹۳ء

ضمیمہ

اس کتاب میں مذکور

احادیث کی تخریج

زیرِنظر کتاب میں جا بجا احادیث مبارکہ کے حوالے موجود ہیں، بلکہ بہت سے مباحث میں احادیث ہی کو استدلال کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ایسی تمام احادیث کو جو کتاب کے مرکزی مضمون سے براہ راست متعلق ہیں،ان کی متون اور حوالہ جات سمیت یہاں ہم نے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح احادیث مبارکہ کا ایک خوبصورت گلدستہ تیار ہوگیا ہے۔

قیامت سے قبل عالمی غلبۂ اسلام کی نوید

عن المقداد ؓ انہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول "لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الاادخلہ اللہ کلمہ الاسلام بعز عزیز و ذل ذلیل..... اما یعزھم اللہ فیجعلھم من اھلھا او یذلھم فیدینون لھا"..... قلت: "فیکون الدین کلہ للہ"(رواہ احمد فی "المسند" بسند صحیح)

عن النعمان بن بشیر ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: تکون النبوۃ فیکم ماشاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اللہ اذا شاء ان یرفعھا، ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوہ، فتکون ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اذا شاء ان یرفعھا، ثم تکون ملکاعاضا فتکون ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اذا شاء اللہ ان یرفعھا، ثم تکون ملکا جبر یا فتکون ما شاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اذا شاء ان یرفعھا، ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوہ، ثم سکت" (رواہ احمدؒ)

ان اول دینکم نبوۃ ورحمۃ وتکون فیکم ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ، ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوۃ ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ، ثم یکون ملکا عاضا فیکون ماشاء اللہ ان یکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ، ثم تکون ملکا جبریۃ فتکون ما شاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اللہ جل جلالہ، ثم تکون خلافۃ علی منھاج النبوۃ تعمل فی الناس بسنۃ النبی یلقی و الاسلام بجرانہ فی الارض یرضی عنھا ساکن السماء وساکن الارض لا تدع السماء من قطر الاصببتہ مدرا راولا تدع الارض من نباتھا و برکاتھا شیئا الّا اخرجتہ۔

(بحوالہ ''تجدید واحیائے دین'' ازمولانا مودودی مرحوم)

علاماتِ قیامت

عن انس بن مالک ؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: "بعثت انا والساعۃ کھاتین، کفضل احداھما علی الاخری وضم السبابۃ والوسطی" (متفق علیہ)

عن المستور بن شداد ؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: "بعثت فی نفس الساعۃ، فسبقتھا کما سبقت ھذہ لھذہ..... لا صبعیہ السبابۃ والوسطی" (رواہ الترمذی)

عن عمر بن الخطاب ؓ قال: بینما نحن جلوس عند رسول اللہ ﷺ ذات یوم، اذ طلع علینا رجل..... قال: فاخبرنی عن الساعۃ۔ قال: مالمسئول عنھا باعلم من السائل۔ قال: فاخبرنی عن اماراتھا۔ قال: ان تلد الامہ ربتھا، وان تری الحفاۃ العراۃ العالۃ رعاء الشاءِ یتطاولون فی البنیان۔" (رواہ مسلم)

عن ابی ھریرۃ ؓ ان رسول اللہ ﷺ قال: "لا تقوم الساعۃ حتی یکثر فیکم المال ویفیض، وحتی یخرج الرجل بزکاۃ مالہ فلا یجد احدا یقبلھا منہ، وحتی تعودارض العرب مروجا وانھارا۔" (رواہ مسلم)

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ! "لا تقوم الساعة حتی یحسر الفرات عن جبل من ذهب یقتتل الناس علیه، فیقتل من کل مائة تسعة وتسعون، فیقول کل رجل منهم لعلی اکون انا انجو۔" (متفق علیه)

عن ابی هریرةؓ عن رسول اللهﷺ قال: "لا تقوم الساعة حتی ینزل فیکم ابن مریم حکما مقسطا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیه ویفیض المال حتی لا یقبله احد۔" (رواه البخاری)

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: "لا تقوم الساعة حتی تطلع الشمس من مغربها، فاذار آها الناس آمن من علیها۔" (متفق علیه)

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: "لا تقوم الساعة حتی تخرج نار من ارض الحجاز تضی ء اعناق الابل ببصری۔" (متفق علیه)

عن انس بن مالكؓ ان رسول اللهﷺ قال: "اوّل اشراط الساعة نار تحشر الناس من المشرق الی المغرب۔" (رواه البخاری)

عن ابی هریرةؓ ان رسول اللهﷺ قال: "یادروا بالاعمال ستا: طلوع الشمس من مغربها، او الدخان، او الدجال، اوالدابة، اوخاصة احدکم، او امرالعامة۔" (رواه مسلم)

عن عوف بن مالكؓ قال: "اتیت النبیﷺ فی غزوة تبوك وهو فی قبة ادم" فقال: "اعدد ستابین یدی الساعة: موتی، ثم فتح بیت المقدس..... ثم فتنة لا یبقی بیت من العرب الادخلته۔" (رواه البخاری)

عن حذیفة بن اسید الغفاری ؓ قال: اطلع رسول اللهﷺ علینا ونحن نتذاکر، فقال: ماتذاکرون؟ قلنا: (نذکر) الساعة۔ قال: "انها لن تقوم حتی تروا قبلها عشر آیات، فذکر الدخان، والدجال، والدابة، وطلوع الشمس من مغربها، ونزول عیسی بن مریم، ویاجوج وماجوج، وثلاثة خسوف: خسف بالمشرق، وخسف بالمغرب، وخسف بجزیرة العرب، وآخر ذلك: نار تطرد الناس الی محشرهم۔"

(رواه مسلم و ابوداؤد والترمذی)

عن انس بن مالكؓ قال: قال رسول اللهﷺ: "لا تقوم الساعة حتی یتقارب الزمان فتکون السنة کالشهر والشهر کالجمعة وتکون الجمعة کالیوم ویکون الیوم کالساعة وتکون الساعة کالضرمة من النار۔" (رواه الترمذی)

عن انس بن مالكؓ ان رسول اللهﷺ قال: "لا تقوم الساعة علی احد یقول: الله الله" وفی روایته: حتی لا یقال فی الارض: الله الله۔"

(رواه مسلم والترمذی)

عن عبدالله بن مسعودؓ قال قال رسول اللهﷺ: "لا تقوم الساعة الا علی شرار الناس۔" (رواه مسلم)

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: "ان الله یبعث ریحا من الیمن الین من الحریر فلاتدع احدا فی قلبه مثقال حبه من ایمان الاقبضته" وفی روایة: "مثقال ذره"۔ (رواه مسلم)

قرب قیامت کی ہولناک جنگیں

عن ابی ابن کعبؓ قال: انی سمعت رسول اللهﷺ یقول: "یوشك الفرات ان یحسر عن جبل ذهب، فاذا سمع به الناس ساروا الیه، فیقول من عنده: لئن ترکنا الناس یأخذون منه لیذهبن به کله، قال: فیقتتلون علیه فیقتل من کل مائة تّسعة وتسعون۔ "(رواه مسلم)

عن ابی هریرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: "لا تقوم الساعة حتی یقاتل المسلمون الیهود، وراء الحجر والشجر، فیقول الحجر والشجر: یا مسلم یا عبدالله! هذا یهودی خلفی، فتعال فتله، الا الغرقد فانه من شجر الیهود۔" (رواه مسلم)

عن ذی مخبرؓ قال سمعت رسول اللهﷺ یقول: "ستصالحون الروم صلحا آمنا، فتغزون انتم وهم عدوا من ورائکم، فتنصرون وتغنمون وتسلمون ثم ترجعون حتی تنزلوا بمرج ذی تلول، فیرفع رجل من اهل النصرانیة الصلیب فیقول: غلب الصلیب، فیغضب رجل من المسلمین فیدقه، فعند ذلك تغدر الروم وتجمع للملحمة۔" زاد فی روایة: ویثور المسلمون الی اسلحتهم فیقتتلون فیکرم الله تلك العصابة بالشهادة۔ (رواه ابوداؤد فی الملاحم)

عن عبدالله بن عمرؓ قال: قال النبیﷺ: "یوشك المسلمون ان یحاصروا الی المدینه حتی یکون ابعد مسالحهم سلاح"..... وعن الزهری سلاح قریب من خیبر..... (رواه ابوداؤد)

عن ثوبان ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: یقتتل عندکنزکم ثلاثة کلهم ابن خلیفة ثم لایصر الی واحد منهم ثم تطلع الرایات السود من المشرق فیقتلونکم قتلالم یقتله قوم۔ ثم ذکر شیئا لا احفظة فقال: فاذا رایتموه فبایعوه ولو حبوا علی الثلج فانه خلیفة الله المهدی۔" (رواه ابن ماجه)

عن ابی هریرة ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "اذا وقعت الملاحم بعث الله بعثا من الموالی هم اکرم العرب فرساواجوده سلاحا یؤید الله بهم الدین۔ (رواه ابن ماجه)

عن ابی هریرة ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: یخرج من خراسان رایات سود فلایردهاشیی حتی تنصب بایلیاء۔ (رواه الترمذی)

عن عبدالله بن الحارث ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: یخرج ناس من المشرق فیوطؤن للمهدی یعنی سلطانه۔ (رواه ابن ماجه)

حضرت مہدی کی شخصیت

عن عبدالله بن مسعود ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ "لاتذهب الدنیا حتی یملك العرب رجل من اهل بیتی یواطی اسمه اسمی" رواه الترمذی، وابوداؤد وفی روایه له: قال: "لولم یبق من الدنیا الا یوم لطول الله ذلك الیوم حتی یبعث الله فیه رجلا منی..... اومن اهل بیتی..... یواطی اسمه اسمی واسم ابیه اسم ابی، یملأ الارض قسطاوعدلا، کما ملئت ظلما و جورا۔"

عن ام سلمه ؓ قالت: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: المهدی من عترتی من اولاد فاطمة۔ (رواه ابوداؤد)

عن ابی سعید الخدری ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: المهدی منی، اجلی الجبهه، اقنی الانف، یملا الارض قسطا و عدلا، کما ملئت ظلما وجورا، یملك سبع سنین۔ (رواه ابوداؤد)

نزولِ عیسیٰؑ اور فتنۂ دجال

عن ابی هریرة ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: والذی نفسی بیده لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم، حکما عدلا، فیکسر الصلیب، ویقتل الخنزیر، ویضع الجزیة، ویفیض المال حتی لا یقبله احد، حتی تکون السجدة الواحدة خیرا من الدنیا وما فیها۔ (متفق علیه)

عن ابی هریرة ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: کیف انتم اذا نزل ابن مریم فیکم وامالکم منکم (متفق علیه)

عن جابر بن عبداللہ ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لا تزال طائفه من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیمة، فینزل عیسی فیقول امیرهم: تعال صل علینا، فیقول: لا، ان بعضکم علی بعض امراء تکرمة الله هذه الامة۔ (رواه مسلم)

عن مجمع بن جاریة الانصاری ؓ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: یقتل ابن مریم الدجال باب لدّ۔ (رواه الترمذی)

عن النواس بن سمعان ؓ قال: ذکر رسول اللہ ﷺ الدجال فقال: ان یخرج وانافیکم فانا حجیجهٗ دونکم، وان یخرج ولست فیکم فامرء حجیج نفسه، واللہ خلیفتی علی کل مسلم، فمن ادرکه منکم فلیقرأ علیه بفواتح سورة الکهف فانها جوار کم فتنة، قلنا: ومالبثه فی الارض؟ قال: اربعون یوما، یوم کسنة و یوم کشهر ویوم کجمعة وسائر ایامه کایامکم، فقلنا: یا رسول الله هذا الیوم الذی کسنة اتکفینا فیه صلوة یوم ولیله؟ قال: لا، اقدروا له قدره، ثم ینزل عیسی بن مریم علیه السلام عند المنارة البیضاء شرقی دمشق فیدر که عند باب لد فیقتله۔

(رواه ابوداؤد و ابن ماجه)

عن النواس بن سمعان ؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ..... کذلك، اذ بعث الله عیسی بن مریم، فینزل عند المنارة البیضاء، شرقی دمشق، بین مهرود تین، واضع کفیه علی اجنحة ملکین، اذا طأطأ راسه قطر واذا رفعه ینحدر منه جان کاللؤلؤ، ولا یحل لکافر یجدریح نفسه الامات، ونفسه ینتهی حیث ینتهی طرفه، فینطلق حتی یدرکه عند باب لدفیقتله..... (رواه ابن ماجه)

عن ابی امامة الباهلی ؓ قال: خطبنا رسول اللہ ﷺ فکان اکثر خطبه حدیثا حدثناه عن الدجال، وحذرناه، فکان من قوله ان قال: "انه لم تکن فتنة فی الارض منذ ذرأ الله ذریة آدم اعظم من فتنة الدجال، وان الله لم یبعث نبیا الاحذر امته لدجال،، وانا آخر الانبیاء وانتم آخر الامم، وهو خارج فیکم لا محالة..... فقالت ام شریك بنت ابی العکر: یا رسول الله! فاین العرب یومئذ؟ قال: هم یومئذ قلیل، وجلهم ببیت المقدس، وامامهم رجل صالح، فبینما امامهم قد تقدم یصلی بهم الصبح اذ نزل علیهم عیسی بن مریم الصبح، فرجع ذلك الامام ینکص یمشی القهقری لیتقدم عیسی یصلی بالناس، فیضع عیسی یده بین کتفیه ثم

يقول له: تقدم فصل فانها لك اقيمت، فيصلى بهم امامهم، فاذا انصرف قال عيسى عليه السلام: افتحوا الباب فيفتح ورائه الدجال معه سبعون الف يهودى كلهم ذوسيف محلى وساج، فاذا نظر اليه الدجال ذاب كما يذوب الملح فى الماء، وينطلق هاربا، ويقول عيسى عليه السلام: ان لى فيك ضربة لن تسبقنى بها، فيدركه عند باب اللد الشرقى فيقتله، فيهزم الله اليهود، فلا يبقى شيىء مما خلق الله يتوارى به يهودى انطق الله ذلك الشيىء، لا حجر ولا شجر ولا حائط ولا دابة (الاالغرقده فانها من شجرهم، لا تنطق) قال: يا عبدالله المسلم هذا يهودى فتعال اقتله۔ (رواه ابن ماجه)۔

عن عبدالله بن عمرو ؓ قال: قال رسول اللهﷺ: ينزل عيسى بن مريم الى الارض، فيتزوج ، ويولد له، ويمكث خمساو اربعين سنة، ثم يموت، فيدفن معى فى قبرى، فاقوم انا وعيسى بن مريم فى قبر واحد بين ابى بكر وعمر۔

(رواه ابن الجوزى فى "كتاب الوفاء)

نہی عن المنکر کی اہمیت

عن ابى سعيد الخدرى ؓ عن رسول اللهﷺ قال: من رآى منكم منكرا فليغيره بيدہ، فان لم يستطع فبلسانہ، فان لم يستطع فبقلبه، وذلك اضعف الايمان۔

(رواه مسلم)

قال رسول اللهﷺ: اوحى الله عزوجل الى جبرائيل عليه السلام ان اقلب مدينه كذا وكذا باهلها، فقال: يا رب ان فيهم عبدك فلانا لم يعصك طرفة عين، قال: فقال: اقلبها عليه وعليهم، فان وجهه، لم يتمعر فى ساعة قط۔ (رواه البيهقى)۔

دیگر متفرق احادیث

عن معاوية ؓ قال..... وهو يخطب..... سمعت رسول اللهﷺ يقول: لا تزال من امتى امة قائمة بامر الله لا يضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتى ياتى امرالله وهم على ذلك۔ (متفق عليه)

عن ابى هريرة ؓ ان رسول اللهﷺ قال: ان الله يبعث لهذة الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها۔ (رواه ابوداوٗد فى الملاحم)۔

عن ابى هريرة ؓ: قال قال رسول اللهﷺ: اكثروا ذكرها ذاللذات الموت۔(رواه الترمذى والنسائى وابن ماجه)

عن ابن عمر ؓ قال: قال رسول اللهﷺ: "ان هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء۔" قيل: يا رسول الله وما جلاء ها؟ قال: "كثرة ذكر الموت و تلاوة القرآن۔" (رواه البيهقى الاحاديث الاربعه فى "شعب الايمان")

والله لتموتن كما تنامون، ثم لتبعثن كما تستيقظون، ثم تستيقظون، ثم لتحاسبن بما تعملون، ثم لتجزون بالاحسان احسانا وبالسوء سوء، وانها لجنة ابدا اولنارا بدا۔ (نهج البلاغة)

عَن عبدالله بن عمرو بن العاص (رضى الله عنهما) قال: قال رسول اللهﷺ: "لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِىْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِى اِسْرَائِيْلَ حَذْ وَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ۔" (رواه الترمذى)